جلد 8، شمارہ 2

مئی تا اگست، 2015

چیلنج

ایڈیٹر: عذرا طلعت سعید

''بنے ہیں اہلِ ہوس، مدعی بھی، منصف بھی''۔

کرہ ارض موسمی بحران کی پیدا کردہ آفات میں جکڑ کر رہ گئی ہے۔ ان آفات کی کڑیاں روشن خیالی کے برپا کردہ صنعتی انقلاب سے ملتی ہیں، جس نے ایک نئے سائنسی طریقہ تحقیق کی ترغیب دیتے ہوئے سرمایہ داری کو پروان چڑھایا۔ آج سائنس سرمایہ داری کے بہترین آلہ کار میں سے ایک ہے۔ اس سائنس نے انسانی خدمت کی بنیاد کو یکسر ختم کرتے ہوئے صرف منافع کی ہوس میں نئی سے نئی ٹیکنالوجی فراہم کی ہے۔ ان ٹیکنالوجیوں کے درپر امیر سرمایہ دار ممالک میں منافع کی جستجو عروج پر ہے۔ بے حساب پیداوار سرمایہ داری نظام کی ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہے جو صنعتی انقلاب سے لے کر آج تک رکازی ایندھن کے بغیر ممکن نہیں۔ یہی رکازی ایندھن موسمی بحران کا اصل ذمہ دار ہے۔ یقیناً تاریخی طور پر کاربن کے اخراج کی ذمہ داری پہلی دنیا کے سرمایہ دار ممالک پر عائد ہوتی ہے نا کہ تیسری دنیا کے ممالک پر۔ سرمایہ دار کے ''شفیق چہرے'' موسمی بحران سے نمٹنے کے لیے متبادل توانائی کی پیداوار کے لیے نئی نئی ترکیبیں پیش کررہے ہیں۔ کہیں جانوروں کے فضلے سے توانائی حاصل کی جارہی ہے اور کہیں نباتاتی فصلوں، شمسی توانائی اور ہوائی توانائی پر تحقیق کے ذریعہ چمچماتی سحر انگیز ٹیکنالوجی ایجاد کی جارہی ہے۔ ان متبادل ایندھنوں پر مبنی ٹیکنالوجیوں کے لیے درکار وسائل کے لیے تیسری دنیا کے سرمائے اور اثاثوں پر حملہ پوری آب و تاب سے جاری ہے۔

سرمایہ دار ممالک اور اس کے پہرے دار ادارے خصوصاً آئی ایم ایف نے وسائل پر قبضے کے لیے پاکستان کو مکمل طور پر اپنے شکنجے میں پھنسایا ہوا ہے جو 2015-16 کے بجٹ سے واضح ہے۔ بجٹ سے خودمختاری کے ہر طریقہ سے کنارا کشی کرتے ہوئے ''ترقی'' کو مکمل طور پر غیر ملکی سرمایہ کاری سے جوڑ دیا گیا ہے۔ کبھی غلامی کی زنجیروں کو کھینچ کر سرکار کو پابند کیا جاتا ہے کہ پیداواری صنعتوں کو نجکاری کے بھینٹ چڑھا دیا جائے اور کبھی مسکرا کر امداد کے مکروہ ہاتھوں سے ''ترقی'' کے سنہرے جھولے میں جھلا کر سرمایہ دار اپنے لیے سرمایہ کاری کے نت نئے راستے استوار کر لیتا ہے۔ بیج کے ترمیمی بل 2015 کے ذریعے پہلے ہی کسان کو مجبور و محتاج کرنے کی کاروائی مکمل کر لی گئی تھی اور اب جانوروں کے لیے بھی جینیاتی طریقہ پیداوار کا استعمال شروع کردیا گیا ہے۔ پاکستان جہاں اعلیٰ نسل کے مویشیوں کی کوئی کمی نہیں وہاں ''جدید'' ٹیکنالوجی کے ذریعہ دودھ کی زیادہ پیداوار دینے والی نسلوں پر زور دیا جارہا ہے۔ ہماری سرکار اس اضافی پیداوار کو موسمی بحران سے نمٹنے کا ایک انمول وسیلہ قرار دے رہی ہے۔ یقیناً دودھ کی زیادہ پیداوار سرمایہ دار کے منافع کے لیے حاصل کی جارہی ہے کیونکہ عوام تو اب صرف اپنے ''لہو سے سرمایہ داری کی عمارت کے لیے رنگ و روغن'' کے قابل رہ گئی ہے، دودھ کے مہنگے ترین ڈبے کہاں سے خریدے گی؟ اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر سرکار کو غریب عوام کی تکلیف اور کسمپرسی کا خیال ہوتا تو کچے کے علاقے میں رہنے والے لاکھوں کسان جو سیلاب سے دربدر ہو چکے ہیں، اس قدر بے حال نہ ہوتے۔ یقیناً مصنوعی طریقوں سے دودھ کی پیداوار بڑھانے کی تگ و دو کے بجائے ان کسانوں کو اگر زمین دے دی جاتی تو وہ نا صرف موسمی بحران سے بچ پاتے بلکہ قومی پیداوار میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے۔ آج نوجوانوں کو گلی کوچے غیر ملکی اشیاء بیچنے پر مجبور کرنے والی حکومت اور اداروں کو کہیں زیادہ زیب دیتا کہ ایسا پائیدار پیداواری نظام کی بنیاد ڈالتے جو مقامی صنعت کے بل بوتے از خود پروان چڑھتا۔

سامراجی قوتوں کے زیر اثر عوام سے مراعات اور سہولیات چھیننے کے ساتھ ساتھ ان پر ٹیکسوں کا اتنا بوجھ ہے کہ وہ دن رات محنت و مشقت کے باوجود بمشکل دو وقت کی روٹی حاصل کر پاتے ہیں۔ مزدور عورت اس نیم جاگیرداری نظام میں بے تحاشہ پستی ہوئی اناج کے حصول کے لیے دربدر کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور ہے۔ عوام کو اب یہ فیصلہ کرنا ہے کہ وہ مفاہمت کا راستہ اپنائے یا پھر مزاحمت پر ثابت قدم ہو جائے!

فہرست مضامین

متبادل ایندھن: استحصال کے نئے ہتھکنڈے 2
دریا کے کنارے آباد بستیاں اور موسمی بحران 10
وفاقی بجٹ 2015-16: ایک جائزہ 19
مال مویشی شعبے پر بین الاقوامی کمپنیوں کا قبضہ 25
کھیت مزدور عورتیں: روزگار کی جدوجہد .. 37
نشاۃ الثانیہ اور نوآبادیات کا امتزاج 44
اصلاح پسندی آخر کب تک! 53
بات تو سچ ہے مگر 55

چیلنج روٹس فار ایکوٹی (Roots for Equity) نے میزریور کے تعاون سے شائع کیا ہے۔

سیکرٹریٹ: اے۔1، فرسٹ فلور، بلاک 2، گلشن اقبال، کراچی
فون، فیکس: 0092 21 3481 3320 فیکس: 0092 21 3481 3321
بلاگ: rootsforequity.noblogs.org

متبادل ایندھن: استحصال کے نئے ہتھکنڈے

تحریر: عذرا طلعت سعید

اس مضمون کا مقصد موسمی تبدیلی کے حوالے سے پچھلے معاہدوں میں کی گئی پالیسی سازی اور اس پر عمل درآمد کے حوالے سے یورپی ممالک کی کارکردگی پر ایک تنقیدی نظر ڈالنا ہے۔ اس کے علاوہ اس سال پیرس، فرانس میں ہونے والے کوپ 21 میں موسمی تبدیلی کے حوالے سے منظور ہونے والے نئے معاہدے کا جائزہ لینا بھی ہے۔

اکیسویں صدی میں دنیا شدید بحرانوں کا سامنا کر رہی ہے۔ ایک طرف بڑے پیمانے پر بے روزگاری اور غربت کے شکار دنیا کے مکین سخت تکلیف اور کسمپرسی اور انسانی وقار سے گری زندگی گزار رہے ہیں۔ دوسری طرف صنعتی طرز ترقی نے پچھلی کئی دہائیوں سے ماحولیات کو شدید ضرب لگا کر موسمی تبدیلی کا ایک طوفان برپا کر رکھا ہے۔

موسمی تبدیلی کی بنیادی وجہ رکازی ایندھن کا بے دریغ استعمال گردانا جاتا ہے۔ رکازی ایندھن جلنے سے کاربن گیسیز خارج ہوتی ہیں جن کو گرین ہاؤس گیسیز کہا جاتا ہے۔ ان گرین ہاؤس گیسیز کی وجہ سے زمینی حدت میں بہت تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔ جس کے اثرات موسمی تبدیلی کی شکل میں واضح ہو رہے ہیں۔ صرف اکیسویں صدی کے شروع کے کچھ سالوں میں ہی دنیا کے ہر حصے میں الگ الگ طرح کی آفات رونما ہوئیں ہیں۔ مثلاً 2013 میں فلپائن میں ہائی یان ٹائی فون، 2014 میں یورپ کے کئی ممالک سیلابوں کے زیر اثر آئے۔ پاکستان میں 2010 کا سیلاب اور پھر جون 2015 میں سندھ میں شدید گرمی کی لہر۔

موسمی تبدیلی کی شروعات کا اندازہ آج سے تقریباً 35 سال پہلے ہی ہو چکا تھا۔ بین الاقوامی سطح پر حکومتوں کا اس موضوع پر سنجیدگی سے غور و فکر 1990 کی دہائی سے سامنے آیا۔

موسمی تبدیلی: بین الاقوامی سطح پر حکومتی سرگرمیاں

1989 میں ورلڈ میٹریو لوجیکل آرگنائزیشن (World Metereological Organization/WMO) اور اقوام متحدہ کے ماحولیاتی پروگرام (United Nations Environmental Program/UNEP) نے بین الاقوامی پینل برائے موسمی تبدیلی (Intergovernmental Panal on Climate Change/IPCC) کا انعقاد کیا۔[1] اس پینل نے ایک عالمی لائحہ عمل کا مطالبہ کیا جس کی بنیاد پر اقوام متحدہ نے 1990 اپنی جنرل اسمبلی میں ایک اور کمیٹی قائم کی جس نے موسمی تبدیلی پر ایک لائحہ عمل کے لیے مسودہ تیار کیا۔ اس مسودہ کو فریم ورک کنونشن برائے موسمی تبدیلی (United Nations Framework Convention on Climate Change/UNFCCC) کہا جاتا ہے۔ UNFCCC (یو این ایف سی سی سی) کو ارتھ سمٹ 1992 کے موقع پر اقوام متحدہ کے رکن ممالک کے دستخط کے لیے پیش کیا گیا۔[2] 1992 ارتھ سمٹ کا مقصد تھا کہ رکازی تیل سے پیدا ہونے والی کاربن گیسیز جنہیں گرین ہاؤس گیسیز کہا جاتا ہے، کا اخراج کم کیا جائے اور موسمی تبدیلی سے آنے والی آفات کے اثرات سے نمٹنے کے لیے ممالک خود کو سنبھالنے کی صلاحیت پیدا کر پائیں۔ اجلاس کے اختتام پر ایک مسودہ "ریو مسودہ برائے ماحولیات اور ترقی 1992" جاری کیا گیا جو کہ اکثر ریو پرنسپلز کے نام سے جانا جاتا ہے۔[3] ریو پرنسپلز جو 27 اصولوں پر مبنی مسودہ ہے خاص کر ماحولیات کی حفاظت اور تیسری دنیا کے ممالک کی ضروریات کو اہمیت دیتا ہے جبکہ پہلی دنیا کے ممالک کو ماحولیات کے بگاڑ کا ذمہ دار ٹھہراتے ہوئے ان پر پائیدار ترقی کے حصول کے لیے زیادہ ذمہ داریاں عائد کرتا ہے۔

جن ممالک نے یو این ایف سی سی سی کے مسودہ پر دستخط کیے وہ "پارٹیز" (Parties) کہلاتے ہیں۔ یہ ممالک یا پارٹیز سالانہ بنیادوں پر موسمی تبدیلی سے جڑے مختلف معاملات کے لیے اجلاس کرتے ہیں۔ اس سالانہ اجلاس کو کانفرنس آف دی پارٹیز (Conference of the Parties/COP) یا کوپ کا نام دیا جاتا ہے۔ IPCC (آئی پی سی سی) جو موسمی تبدیلی پر عبور رکھنے والے سائنس دانوں پر مبنی پینل ہے اس اجلاس میں غیر رسمی مگر اہم ترین کردار رہا ہے کیونکہ وہ COP (کوپ) کی اپنی سائنسی شاخ کو موسمی تبدیلی کے حوالے سے اہم مواد اور دیگر معلومات فراہم کرتا ہے۔[4]

یو این ایف سی سی سی ایک ایسا مسودہ ہے جس نے پہلی دنیا کے سرمایہ دار ممالک پر موسمی تبدیلی کا الزام واضح کیا تھا۔ یہ خیال ہے کہ موسمی تبدیلی کی وجہ ترقی یافتہ ممالک کی صنعتی پیداوار پر مبنی ترقی ہے جبکہ اس طریقہ پیداوار کا خمیازہ غریب ممالک کے عوام بھگت رہے ہیں۔ یکے بعد دیگرے آنے والی شدید نوعیت کی موسمی آفات سے غریب آبادیوں کے لیے نمٹنا ممکن نہیں ہے۔

1997 میں کوپ کے تیسرے اجلاس میں کیوٹو پروٹوکول پر دستخط ہوئے جو عالمی سطح پر پہلا معاہدہ تھا جس کے تحت گرین ہاؤس گیسیز میں کمی کے لیے رضا مندی ظاہر کی گئی اور 2005 میں جا کر اس معاہدے پر عمل درآمد شروع ہوا۔ یہ معاہدہ 2020 تک نافذ رہے گا۔ 2011 میں جنوبی افریقہ میں منعقد ہونے والے کوپ 17 میں حکومتوں نے موسمی تبدیلی کے ایک نئے عالمی معاہدے کا فیصلہ کیا۔ جسے 2015 تک مکمل کرنا تھا۔ کوپ 21 میں اس نئے معاہدہ کو 2020 میں کیوٹو پروٹوکول کی مدت ختم ہونے کے بعد نافذ کیا جائے گا۔

موسمی تبدیلی: تاریخی قصوروار

یو این ایف سی سی سی نے واضح طور پر بیان کیا ہے کہ

’’گرین ہاؤس گیسیز کی ماحول میں مقدار کو اس حد تک کم کیا جائے کہ موسمی نظام میں خطرناک انسانی مداخلت اثر انداز نا ہو۔ اس حد کو حاصل کرنے کے لیے ایک وقت مقرر کرنا ضروری ہے تاکہ ماحولیاتی نظام کو قدرتی طور پر موسمی تبدیلی سے ہمکنار ہونے کا موقع ملے اور یہ یقین ہو جائے کہ غذائی پیداواری نظام کو خطرہ لاحق نہیں ہے اور معاشی ترقی پائیدار طریقہ سے آگے بڑھ پائے‘‘۔[5]

یو این ایف سی سی سی کے تحت 2010 میں کین کن میں معاہدہ طے ہوا کہ زمین کا درجہ حرارت دو ڈگری سیلسیس سے زیادہ نہ بڑھے۔[6] یہ سمجھنا اہم ہے کہ دنیا کا درجہ حرارت کا بڑھنا غیر قدرتی عمل ہے۔ آئی پی سی سی نے اپنی 2007 کی رپورٹ میں واضع طور پر بیان کیا تھا کہ زمین کی حدت بڑھنے کی 90 فیصد سے زیادہ وجہ انسانی عمل ہے۔[7]

انسانی عمل میں سب سے اہم عمل گرین ہاؤس گیسیز کا اخراج ہے۔ گرین ہاؤس گیسیز کس طرح سے خارج ہوتی ہیں؟ یہ گیسیز چھ طرح کی گیسیز پر مبنی ہوتی ہیں جن میں کاربن ڈائی آکسائیڈ (CO_2)، میتھین (CH_4) اور نائٹرس آکسائیڈ (N_2O) ماحول میں پائی جاتی ہیں۔ جبکہ کچھ فلورنیٹیٹ گیسیز ہیں جن میں ہائیڈروفلورو کاربنز، پرفلورو کاربنز، سلفر ہگیزا فلورائیڈ اور نائٹروجن ٹرائی فلورائیڈ مصنوعی (synthetic) گیسیز ہیں جو صرف صنعتی پیداوار سے خارج ہوتی ہیں۔ یہ صنعتی گیسیز گو کہ کم مقدار میں خارج ہوتی ہیں لیکن یہ کافی طاقت ور گرین ہاؤس گیسیز ہیں جن سے زمین کی حدت بہت بڑھتی ہے۔[8]

ان گرین ہاؤس گیسیز کے اخراج کا کون ذمہ دار ہے؟ یو این ایف سی سی سی نے یہ تو کہہ دیا کہ انسانی کارکردگی سے موسمی تبدیلی رونما ہورہی ہے۔ پر کیا سب انسان اس میں برابر سے شریک ہیں؟ ایسا نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یو این ایف سی سی سی بالخصوص ’’کامن بٹ ڈیفرین شی ایٹیڈ‘‘ ذمہ داریوں پر زور دیتا ہے جو کہ ریو پرنسپلز کا بھی حصہ ہیں۔ اس حوالے سے یو این ایف سی سی سی نشاندہی کرتا ہے کہ:

’’تمام پارٹیز کو موسمی نظام کی موجودہ اور آنے والی نسلوں کے لیے حفاظت کرنی چاہیے۔ جو منصفانہ طور پر ممالک میں تفریق کی بنیاد پر ذمہ داری عائد کرتا ہو اور ان ممالک کی اہلیت پر مبنی ہو‘‘۔[9]

اس اصول کا اشارہ پہلی دنیا کہ امیر ترین ممالک کی طرف ہے جہاں پر سب سے زیادہ گرین ہاؤس گیسیز کا اخراج پایا جاتا ہے۔

1850-2007 کے دورانیے پر مبنی اعداد و شمار بتاتے ہیں کہ امریکہ میں گرین ہاؤس گیسیز کا اخراج سب سے زیادہ رہا ہے (فیگر 1)۔ جبکہ دوسرے، تیسرے نمبر پر آنے والے ممالک چین اور روس کا گرین ہاؤس گیسیز کا اخراج امریکہ کے ایک تہائی اخراج کے برابر ہے۔ یہ نہایت اہم نقطہ ہے کہ ان اعداد و شمار کو ممالک کی عوام کی تعداد کی بنیاد پر بھی دیکھا جانا چاہیے۔ اگر اس بنیاد پر پرکھا جائے تو سب سے زیادہ

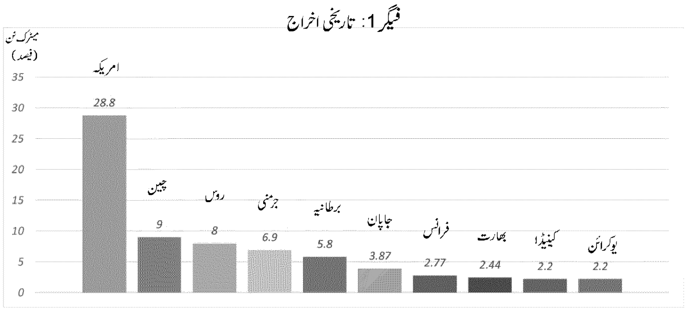

Source: The Guardian, April 21, 2011.

اخراج یورپی یونین (کے دیگر ممالک)، امریکہ اور کینیڈا کا ہے۔ (فیگر 2)

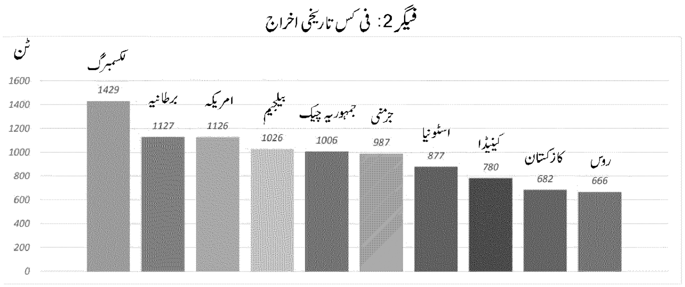

Source: The Guardian, April 21, 2011.

2011 کے بعد سے جو اعداد و شمار دیے جارہے ہیں اس میں سب سے زیادہ گرین ہاؤس گیسیز کے اخراج کی ذمہ داری 10 ممالک پر عائد کی جارہی ہے جو کہ دنیا کہ کل اخراج کا 70 فیصد خارج کرتے ہیں۔[10] ان ممالک میں چین، امریکہ، یورپی یونین (28 ممالک)، بھارت، روس، انڈونیشیاء، برازیل، جاپان، کینیڈا اور میکسیکو شامل ہیں۔ لیکن اگر ان اعداد و شمار کو ایک دفعہ پھر سے ان ممالک کی آبادیوں کو سامنے رکھتے ہوئے پرکھا جائے تو واضح ہے کہ گرین ہاؤس گیسیز کے اخراج کا کون ذمہ دار ہے۔ ان ممالک کو پہلی اور تیسری دنیا کی تفریق سے الگ کردیں تو امریکہ، کینیڈا، یورپی یونین اور جاپان کی مجموعی آبادی تقریباً 990 ملین ہے۔ جبکہ صرف چین اور بھارت کی آبادی 3.2 بلین کے لگ بھگ ہے۔ اگر ہم فہرست میں تیسری دنیا کے تمام ممالک شامل کرلیں یعنی بھارت، چین، انڈونیشیاء، برازیل اور میکسیکو تو کل آبادی تقریباً 3.1 بلین ہوتی ہے۔[11] قابل ذکر بات یہ ہے کہ پاکستان کا گرین ہاؤس گیسیز کے کل اخراج میں صرف 0.8 فیصد حصہ ہے۔[12]

ان حالات میں یہ بحث کے اب سب سے زیادہ عالمی گرین ہاؤس گیسیز کا اخراج چین اور بھارت سے ہورہا ہے دو حوالوں سے بالکل نا انصافی کی بنیاد پر مبنی الزام ہے۔ ایک تو یہ کہ تاریخی اعتبار سے پہلی دنیا کے ترقی یافتہ ممالک گرین ہاؤس گیسیز کے اخراج کے ذمہ دار ہیں اور آج بھی یہی تناسب برقرار ہے کیونکہ پہلی دنیا کہ تمام ممالک مل کر بھی چین کی کل آبادی سے کم ہیں۔ اس لیے اگر ہم کاربن کے اخراج کو فی کس کی بنیاد پر پرکھیں تو امریکہ اور یورپی یونین کا اخراج بہت زیادہ ہیں۔

موسمی تبدیلی: پالیسی سازی اور عمل درآمد

یو این ایف سی سی سی کے بننے کے بعد سے موسمی تبدیلی کے حوالے سے عالمی سطح پر پالیسی سازی نے دو رخ اختیار کیے ہیں۔

1۔ گرین ہاؤس گیسیز کے اخراج کو کم کرنا (Mitigation)۔

2۔ زمینی درجہ حرارت میں اضافے کی بنیاد پر آنے والی "قدرتی" آفات کے نتیجے میں جن خطرات کا سامنا ہے انہیں کم کرنا (Adaptation)۔

یہ دونوں طریقے دو نکات پر زور دیتے ہیں ایک یہ کہ متبادل توانائی استعمال کی جائے اور دوسرا یہ کہ منڈی پر مبنی پالیسی سازی کی جائے۔ دوسرے لفظوں میں نیولبرل طرز معیشت کے بنیادی ستونوں نجکاری، ڈی ریگیولیشن اور آزاد تجارت جیسی پالیسی سازی کو موسمی بحران سے نمٹنے کے لیے اپنایا جا رہا ہے۔

دیکھنے کی ضرورت ہے کہ 1992 سے لے کر اب تک سرمایہ دار امیر ممالک جو کہ اس آفت کے مکمل ذمہ دار ہیں، موسمی تبدیلی کے حوالے سے کیا رجحان ہے؟

کیوٹو پروٹوکول جو یو این ایف سی سی سی کے مقاصد کی تقلید کرتا ہے کے تحت یہ طے پایا تھا کہ یو این ایف سی سی سی کے انیکس 1 پر مبنی ممالک اپنے کاربن اخراج کو 1990 کے اخراج کی سطح سے آٹھ فیصد کم کریں۔[13] یہ ہدف 2008-2012 کے دوران حاصل کیا جانا تھا۔ انیکس 1 پارٹیز میں او ای سی ڈی کے ممبر صنعتی ممالک اور EIT (ای آئی ٹی) ممالک جن میں رشین فیڈریشن، بالٹک اسٹیٹس اور وسطی اور مشرقی یورپ کے دیگر ممالک بھی شامل ہیں۔ یہاں یہ قابل ذکر ہے کہ امریکہ نے کیوٹو پروٹوکول پر دستخط نہیں کیے کیونکہ اس کا مطالبہ تھا کہ اخراج میں کمی تیسری دنیا کے ممالک کو بھی کرنی چاہیے۔[14]

کیوٹو پروٹوکول کے تحت منڈی پر مبنی تین نئے طریقہ اختیار کیے گئے جن کے ذریعے گرین ہاؤس گیسیز کے اخراج کو کم کرنے کے لیے اقدام اٹھائے گئے۔[15]

i۔ کلین ڈیولپمنٹ میکنزم (Clean Development Mechnism/CDM) یعنی تیسری دنیا کے ممالک کو ایسے پائیدار ترقیاتی منصوبوں کے لیے امداد فراہم کرنا جو یا تو گرین ہاؤس گیسیز کا اخراج کم کریں گے یا پھر ان گیسیز کو جذب کرنے کے طریقے اپنائیں گے۔ جذب کرنے کے لیے یا تو نئے جنگلات یا پھر پرانے جنگلات میں مزید درخت لگا کر ان میں وسعت اور بہتری لانا مراد ہے۔

ii۔ مشترکہ طور پر پروگرام لاگو کرنا۔ (Joint Implementation/JI) اس میں پروگراموں اور منصوبوں کا رخ ان ممالک کی طرف ہے جو بند معیشت سے نکل کر آزاد تجارت یا لبرل ازم پر مبنی معیشت اختیار کر رہے ہیں۔ ایسے ممالک کو اکنامیز ان ٹرانزیشن (Economies in Transition/EIT) کہا جاتا ہے۔

iii۔ کاربن گیسیز کے اخراج کی تجارت (Emission Trading) جس کے تحت یو این ایف سی سی سی میں اینکس 1۔ پارٹیز کی آپس میں اخراج پر دیے جانے والے کریڈٹ یا الاؤنس کی تجارت۔

موسمی تبدیلی کی بنیادی وجہ رکازی ایندھن کا بے دریغ استعمال ہے۔ اسی لیے امیر سرمایہ دار ممالک نے موسمی تبدیلی سے نمٹنے کے لیے سب سے زیادہ توجہ متبادل توانائی کے ذرائع پر لگائی ہے۔ اس حوالے سے 2007 میں یورپی یونین کے ممالک نے نئے لائحہ عمل (فریم ورک) کا اعلان کیا جسے "2020 تک 20۔ 20۔ 20" (20-20-20 by 2020) کہا جاتا ہے۔ اس نئے لائحہ عمل میں تین اہداف کو سامنے رکھا گیا۔[16]

(i) 1990 کی سطح کے مقابلے گرین ہاؤس گیسیز کے اخراج میں کم از کم 20 فیصد کمی۔

(ii) توانائی کے مجموعی استعمال میں 20 فیصد حصہ متبادل توانائی کا اور اس کے علاوہ متبادل ایندھن کا 10 فیصد رکھا گیا۔

(iii) 2020 تک یورپی یونین میں کل استعمال ہونے والی توانائی میں 20 فیصد توانائی کی بچت۔

اس حوالے سے اگر ہم یورپی یونین کی پالیسی سازی پر نظر ڈالیں تو مندرجہ ذیل حقائق سامنے آتے ہیں:[17]

- متبادل توانائی کے لیے مخصوص لائحہ عمل بنایا گیا ہے جس کو اسٹریٹیجک انرجی ٹیکنالوجی پلان (SET Plan) کہا جاتا ہے۔
- یورپی یونین میں متبادل توانائی کی ایجاد پر مبنی تحقیق کو سرکاری اور نجی کاروباری شعبے نے بڑے پیمانے پر فروغ دیا ہے۔
- SET Plan (سیٹ پلان) کو نافذ کرنے کے لیے اعلیٰ درجے کے پروگرام نافذ کیے گئے ہیں جنھیں کو یورپی انڈسٹریل اینیشی ایٹیوز (European Industrial Initiatives/EII) کہا جاتا ہے۔ اس منصوبہ بندی میں کاروباری صنعتوں، تحقیقی ادارے، یورپی یونین کے رکن ممالک اور یورپی کمیشن کا اشتراک ہے۔
- EII (ای آئی آئی) کے تحت چھ مخصوص ٹیکنالوجیوں کی نشاندہی کی گئی ہے جن میں شامل ہیں (1) ہوائی توانائی۔ (2) شمسی توانائی۔ (3) بجلی گریڈز۔ (4) بائیو انرجی۔ (5) کاربن اور جمع کرنے پر مبنی ٹیکنالوجی۔ (6) نیوکلر فیشن (nuclear fission) اور فیول سیلز اور ہائیڈروجن (Fuel Cells and Hydrogen)۔ ان سیٹ پلان ٹیکنالوجیوں پر یورپی یونین نے 2010 میں 2.26 بلین یورو دیگر ذرائع سے فراہم کیے۔ توانائی کے شعبے میں یورپی یونین کا نجی شعبہ بھی اہم کردار رکھتا ہے۔ مثال کے طور پر یورپ میں ہوائی توانائی کے شعبہ میں تحقیق کے لیے فراہم کردہ سرمائے کا 76 فیصد حصہ نجی کارپوریٹ شعبہ کی طرف سے ہے۔[18] اگر صرف جرمنی کے نجی شعبے کا جائزہ لیا جائے تو اس نے 2010 میں اپنے کل تحقیقی اخراجات کا 72 فیصد حصہ شمسی اور ہوائی توانائی پر خرچ کیا ہے۔[19]

یورپ نے کاربن گیسیز کے اخراج کو متبادل توانائی کے دیگر طریقے استعمال کرتے ہوئے کم کیا ہے۔ ان متبادل توانائی کے طریقوں میں شمسی اور ہوائی ٹیکنالوجی بڑے پیمانے پر استعمال کی گئی ہے جس کی وجہ سے یورپ نے کیوٹو پروٹوکول میں کیے گئے وعدوں کو پورا کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔

سوال یہ ہے کہ اس متبادل ٹیکنالوجی کا تیسری دنیا کے ممالک پر کیا اثر پڑ رہا ہے؟ اس سوال کا جواب عالمی سطح پر طے ہونے والے پائیدار ترقی کے اہداف ترقی کو مدنظر رکھتے ہوئے جواب دیا جارہا ہے۔ اس سال ستمبر میں اگلے 15 سال کے لیے ترقیاتی منصوبہ بندی کے لیے لائحہ عمل پیش کردیا جائے گا۔ ابھی تک ہر ملک اقوام متحدہ کے تحت طے کردہ ملینیم ڈیولپمنٹ اہداف پر مبنی ترقیاتی منصوبہ بندی کررہا تھا۔ 2012 میں اقوام متحدہ کی منعقد کردہ کانفرنس ریو + 20 پائیدار ترقی کی نشاندہی کی گئی تھی اور اسی تصور پر 2015 کے بعد کے ترقیاتی منصوبے تشکیل دیے جانے ہیں۔

پائیدار ترقی کے حوالے سے عوامی گروہوں نے جو کلی تصور پیش کیا ہے اس کو ''ترقیاتی انصاف'' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ ترقیاتی انصاف عوام کی ترقی کے لیے انصاف کو بنیاد بناتے ہوئے معاشی اور معاشرتی انصاف، صنفی انصاف، موسمی انصاف اور عوام کو جوابدہی کی نشاندہی کرتا ہے۔ پائیدار ترقی کے حوالے سے بین الاقوامی سرکار نے آگلی دہائیوں کے لیے 17 اہداف کی نشاندہی کی ہے جو غربت اور بھوک کے خاتمے، بہتر روزگار، صنفی انصاف کے علاوہ موسمی تبدیلی سے لڑنے کے لیے عملی کاروائی کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہیں۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ عوامی گروہوں نے بنیادی ناانصافیوں کے خاتمے کے لیے جو کلی ڈھانچہ پیش کیا تھا اس کو بین الاقوامی سرکار نے نظرانداز کرتے ہوئے اصلاح پسندی پر مبنی اہداف کی نشاندہی کی ہے۔

اگر اب ہم صرف بین الاقوامی سرکار کی طرف سے پیش کردہ پائیدار ترقی کے اہداف کے تناظر میں یورپ کی متبادل ٹیکنالوجیوں کا تنقیدی جائزہ لیں تو کچھ اہم ترین مسائل سامنے آتے ہیں۔ متبادل توانائی کی پیداوار امیر سرمایہ دار ممالک کے لیے ایک اہم ترین ہدف ہے۔ ان ممالک کے لیے پیداوار کی سطح کو برقرار رکھنا نہایت اہم ہے کیونکہ اس پیداوار کے ذریعے ہی منافع کا حصول ممکن ہے۔ دوسرا اہم نکتہ یہ ہے کہ امیر ممالک میں پائے جانے والا معیار زندگی توانائی کے استعمال سے مکمل طور پر جڑا ہوا ہے۔ اگر موسمی بحران کو سامنے رکھتے ہوئے رکازی ایندھن نہیں استعمال ہوسکتا تو پھر ان ممالک کے لیے متبادل ایندھن ایک اشد ضرورت ہے جو امیر سرمایہ دار ممالک میں پائے جانے والی پرتعیش زندگی کو برقرار رکھ سکتا ہے۔

یورپی یونین بہت فخر سے دنیا کو باور کرواتی ہے کہ اس نے کیوٹو پروٹوکول کے تحت کیے گئے وعدوں کے مطابق اپنے کاربن اخراج کی سطح کو کم کیا ہے۔ 2013 میں ہی یورپی یونین نے اخراج 19 فیصد تک کم کر کے 2020 کے مقرر کردہ وقت سے آٹھ سال پہلے ہی اپنے اخراج کم کرنے کے حدف کو حاصل کرلیا تھا۔[20] یہاں یہ نقطہ اہم ہے کہ دراصل یورپ نے کاربن اخراج میں کمی صرف متبادل توانائی کے استعمال سے حاصل نہیں کی بلکہ یورپ میں معاشی بدحالی کی وجہ سے پیداوار میں کمی واقع ہوئی تھی جس نے اس حدف کو حاصل کرنے میں مدد فراہم کی۔ جیسے کے پہلے بتایا گیا کہ امریکہ نے تو صاف کیوٹو پروٹوکول معاہدے سے انحراف کیا اور کینیڈا کو جب سمجھ آ گئی کہ وہ اخراج کم نہیں کرسکتا تو کیوٹو پروٹوکول کے معاہدے سے باہر آ گیا۔[21] کاربن اخراج کی کمی میں اس نقطہ کو بھی نہیں واضح کیا جارہا ہے کہ کئی یورپی اور امریکی کمپنیاں اب اپنے کارخانے تیسری دنیا کے ممالک خاص کر کے چین اور بھارت لے جارہے ہیں۔[22] جب یورپی ممالک اپنے اخراج کے کم ہونے پر زور دیتے ہیں تو اس اہم ترین نقطہ کو سراسر نظرانداز کردیتے ہیں۔

اس کے باوجود یورپ میں بڑے پیمانے پر متبادل توانائی پر تیار کردہ لائحہ عمل کی کامیابی کو عوامی گروہوں کے پائیدار ترقی کے حصول کے لیے منتخب کردہ اہداف سے جانچنا اہم ہے۔ جیسے کے پہلے لکھا گیا کہ پائیدار ترقی کا ایک اہم حدف معاشی اور معاشرتی انصاف ہے۔ اب اگر ہم صرف متبادل ایندھن ہی پر نظر دوڑائیں جو کے موسمی بحران کو قابو لانے کے لیے ایک اہم ہدف ہے تو متبادل ایندھن پر مبنی پالیسی سازی سنگین مسائل کو جگہ دیتی نظر آتی ہے۔

او ای سی ڈی کے اعداد و شمار کے مطابق یورپی یونین میں فصلوں سے حاصل کردہ ایندھن (ایگروفیول) میں 2005 سے لے کر 2010 تک بڑے پیمانے پر اضافہ ہوا ہے۔[23] 2005 میں 2,940 ملین لیٹرز پیداوار حاصل کی گئی جو کہ 2010 میں 6,230 ملین لیٹرز ہوگئی اور 2015 کے لیے ممکنہ اعداد وشمار کے مطابق اس سال 11,450 ملین لیٹرز پیداوار کی امید ہے۔ یعنی 10 سال کے اندر پیداوار میں تقریباً 290 فیصد اضافہ دیکھا گیا ہے۔

یورپی کمیشن کی ایک رپورٹ کے مطابق بائیو انرجی (یعنی نباتیاتی ایندھن) کے شعبہ میں یورپی سرکار نے نجی شعبہ کے مقابلے میں تحقیق کے لیے کم مالی وسائل خرچ کیے ہیں۔[24] جن ممالک کی سرکار نے بائیو انرجی پر مبنی ٹیکنالوجی پر تحقیق کے لیے زیادہ سرکاری رقم خرچ کی ہے ان میں سوئیڈن، فرانس اور برطانیہ شامل ہیں۔ انہی ممالک کی کمپنیوں نے بھی بائیو فیول (نباتاتی ایندھن) پر تحقیق کے لیے زیادہ وسائل لگائے ہیں۔ ان ممالک میں خاص کر جرمنی فرانس، اٹلی اور برطانیہ شامل ہیں۔ ان کمپنیوں کی تحقیق کا رخ بائیو ڈیزل، بائیو ایتھنول اور بائیوگیس کی طرف سب سے زیادہ تھا۔ یہ کمپنیاں خاص کر بائیو فیول کمپنیاں، بڑے پیمانے پر گاڑیاں بنانے والی صنعت اور تیل کی صنعت سے تعلق رکھتی تھیں۔ ان کمپنیوں نے بائیو انرجی پر تحقیق و ترقی (R&D/Reserch and Development) پر 750 ملین یورو خرچ کیے جو 2007 سے 2010 کی کے مدت میں تین گنا اضافہ ہے۔

پاکستان میں 2005 میں ایگرو فیول کی پیداوار 143.65 ملین لیٹرز قرار دی گئی تھی جو 2010 میں 263.2 ملین لیٹرز ہوگئی اور 2015 میں خیال کیا جاتا ہے کہ 321.8 ملین لیٹرز تک پہنچ جائے گی۔[25] یعنی 10 سال کے وقفہ میں 124 فیصد اضافہ

دیکھا گیا ہے۔ پاکستان میں زیادہ تر گنے کی کاشت سے ایگرو فیول حاصل کیا جارہا ہے۔ پاکستان شوگر ملز ایسوسی ایشن کے مطابق 5-2004 میں 36.66 ملین لیٹرز ایتھنول برآمد کیا گیا جبکہ 14-2013 تک یہ مقدار 492.47 ملین لیٹرز ہوگئی یعنی 13 سال کے اندر برآمد میں 1243 فیصد اضافہ ہوا ہے۔ پاکستان عالمی سطح پر ایتھنول برآمد کرنے والے ممالک میں چوتھا بڑا ملک سمجھا جاتا ہے۔ یورپ، مشرق وسطیٰ، مشرق ایشیاء اور جنوب مشرقی ایشیاء میں پاکستان سے برآمد کردہ ایتھنول کی بڑی مانگ ہے۔ 04-2003 سے لے کر 14-2013 کے دورانیے میں گنے کا زیر کاشت رقبہ 1,074,700 ہیکٹرز سے 1,171,687 ہیکٹرز ہو گیا ہے۔ یعنی دس سال کے عرصے میں گنے کے زیر کاشت رقبے میں نو فیصد اضافہ ہوا ہے۔

گنے کی کاشت میں ایک اور اہم نقطہ پانی کا استعمال ہے۔ حکومت پاکستان کے مطابق پاکستان کی سات اہم فصلوں میں سے گنے میں پانی کا استعمال سب سے زیادہ ہے۔[26] پاکستان میں معاشی اور معاشرتی ناانصافیوں کی بنیاد زرعی زمین کی غیر منصفانہ ملکیت ہے۔ پاکستان کی زرعی زمین کا زیادہ رقبہ بڑے بڑے جاگیرداروں کے پاس ہے۔ کسانوں کی اکثریت یا تو بے زمین ہیں یا پھر بہت چھوٹے رقبوں کی ملکیت رکھتی ہے۔ گنے کی فصل کئی طرح کے مسائل پیدا کرتی ہے۔ زیادہ پانی کا استعمال پہلے ہی واضح کردیا ہے۔ اس کے علاوہ یہ فصل 12 مہینے کھڑی رہتی ہے اور اس طرح ایک طرف گندم کی فصل گنے کی وجہ سے نہیں لگائی جاتی اور بہت بڑے پیمانے پر چھوٹے اور بے زمین کسانوں کے علاوہ دیہی آبادیاں گندم کے حصول کے لیے در بدر ہوتی ہیں۔ دوسری طرف گنے کی فصل کیونکہ 12 مہینے تک لگی رہتی ہے تو دیہی مزدور کے لیے روزگار کے مواقع کم ہو جاتے ہیں۔ اوپر سے ظلم یہ کہ جب گنا کاٹا جاتا ہے تو نہایت مشکل مشقت آمیز کام کوڑیوں کے مول لیا جاتا ہے۔ ایک ٹرالی گنا بھرنے کے لیے چار سے پانچ مزدور لگتے ہیں۔ فی کس مزدوری اگر من کے حساب سے نکالی جائے تو ایک من کاٹنے اور ٹرالی میں لادنے کے 17 روپے دیے جاتے ہیں۔ مزید یہ کہ اگر ٹرالی سفر کے دوران گر جائے تو انہیں مزدوروں کو واپس بلا کر ٹرالی پھر سے لوڈ کی جاتی ہے۔ مزدوروں کا کہنا ہے کہ گنا کاٹنے کی مزدوری مشکل سے دو مہینے رہتی ہے اور ایک مہینے میں زیادہ سے زیادہ 15,000 روپے کمائے جاتے ہیں۔ جبکہ کام پورے دن سے کہیں زیادہ لیا جاتا ہے۔ اوقات کار کے دوران کھانا مفت نہیں کھلایا جاتا۔ اگر کنبہ آکر مزدوری کررہا ہو تو مزدور عورتوں کو مزدوری ملتی ہی نہیں کیونکہ گھر کے مرد مزدوری رکھ لیتے ہیں۔[27] جنوبی پنجاب میں یہ ایک عام بات ہے کہ عورتیں اگر مزدوری کے لیے جاتی ہیں تو ان سے فصل بغیر مالی معاوضے کے کٹوائی جاتی ہے۔ فصل کٹنے کے بعد جو بھوسہ بچ جاتا ہے وہ عورتوں کو دے دیا جاتا ہے۔ چونکہ بڑے پیمانے پر گنا لگایا جارہا ہے اور جانوروں کے چارے کا مسئلہ سنگین ہے اس لیے مزدور عورتیں اپنے مال مویشیوں کو پالنے کے لیے اتنا سخت محنت طلب کام کرنے پر راضی ہوجاتی ہیں۔ یہ عجب معاملہ ہے کہ زراعت جیسے اہم ترین شعبے میں اب تک مزدور قوانین لاگو نہیں کیے گئے اور یہ شعبہ بدستور غیر رسمی قرار دیا جاتا ہے۔ سیاسی ناانصافی کی بنیادی وجہ مزدور طبقہ کو غیر رسمی قرار دے کر قائم رکھنا بہت آسان ہے۔

گنے کی کاشت جاگیرداروں اور شوگر مل مالکان کے لیے نہایت منافع بخش ہے۔ اس فصل سے نا صرف شکر بلکہ مولسس، ایتھنول، بھوسا اور دیگر اشیاء حاصل کی جارہی ہیں۔[28] گنے کی بڑے پیمانے پر بڑھتی ہوئی کاشت ناصرف جاگیرداروں اور زرعی کاروباری شعبے کی دولت میں اضافہ کررہی ہے بلکہ اس دولت سے اس طبقے کا سیاسی وزن بھی بڑھ جاتا ہے۔ پاکستان کی قومی وصوبائی اسمبلیوں میں بڑے جاگیردار وزمیندار خاندانوں کی بھرپور نمائندگی بالکل واضح ہے۔ یہ سیاسی نمائندگی دیہی آبادیوں کو نہ سیاسی انصاف فراہم کرتی ہے نہ معاشرتی انصاف۔ اس میں شک نہیں کہ شکر کا پیداواری شعبہ دنیا بھر میں ایک بااختیار ظالم طبقہ تیار کررہا ہے جس کے ظلم و استحصال کی داستانیں کئی ملکوں سے موصول ہورہی ہیں۔[29]

پوری دنیا میں متبادل توانائی کے لیے اب شمسی توانائی کا بڑھ چڑھ کر پرچار کیا جارہا ہے۔ شمسی توانائی حاصل کرنے کے لیے سولر پینلز پر مبنی نئی ٹیکنالوجی متعارف کروائی جارہی ہے۔ اس ٹیکنالوجی کو زیر غور لائیں تو کئی پریشان کن پہلو سامنے آتے ہیں۔ پاکستان میں کئی کمپنیاں اب ٹیوب ویل چلانے کے لیے سولر پینلز فروخت کررہی ہیں۔ ان میں سے ایک نواز انرجی بھی ہیں۔ ان کے کارکنوں سے سرسری معلومات حاصل کرنے سے پتہ چلا کہ ٹیوب کے لیے 7.8 کلو واٹ توانائی حاصل کرنے پر تقریباً 1.6 ملین روپے کی لاگت آتی ہے۔ مکمل اور صحیح معلومات پوری تحقیق کے بعد فراہم کی جاتی ہے۔ اخبار ڈان کی ایک خبر کے مطابق پاکستان میں تقریباً ایک ملین ٹیوب ویل ڈیزل یا پھر بجلی پر چل رہے ہیں۔ اس خبر کے مطابق تین مختلف قیمتوں کے سولر پینل موجود ہیں جو کہ ایک سے ڈیڑھ ملین، ڈیڑھ سے دو ملین اور دو سے تین ملین روپے میں حاصل کیے جاسکتے ہیں۔[30] مضمون یہ بھی واضح کرتا ہے کہ سولر پینل سے حاصل کردہ توانائی صاف اور پائیدار ہے پر اسے لگانے کے لیے درکار سرمایہ کسانوں کے بس میں نہیں اس کے لیے قرضے کی سہولت فراہم کی جانی چاہیے۔

زمین کے حوالے سے شمسی توانائی حاصل کرنے کے لیے بڑے منصوبے زیادہ مسائل پیدا کرسکتے ہیں۔ شمسی توانائی دو طرح کی ٹیکنالوجی استعمال کررہی ہے۔ ایک فوٹو وال ٹیک (Photovoltaic/PV) سولر سیلز کہلاتی ہے اور دوسری کانسنٹریٹنگ سولر پاور (concentrating solar power/CSP) کہلاتی ہے۔[31] اگر یوٹیلیٹی اسکیل پی وی (utility scale PV) استعمال کیا جارہا ہے تو ایک میگاواٹ حاصل کرنے کے لیے تقریباً 3.5-10 ایکڑ تک زمین درکار ہے۔ اگر CSP (سی ایس پی) پلانٹس استعمال کیے جارہے ہیں تو 4 سے 16.5 ایکڑ زمین ایک میگاواٹ کے لیے درکار ہے۔ پانی کے استعمال کے مسائل سی ایس پی پلانٹس کے ساتھ زیادہ جوڑے جارہے ہیں۔ کیونکہ یہ تکنیک شمسی توانائی پیدا کرنے میں پانی کا بہت استعمال کرتی ہے۔ امریکی حکومت کی ایک رپورٹ کے مطابق جہاں پر سورج کی روشنی کی زیادتی ہے وہاں اکثر

پانی کے وسائل کی کمی بھی پائی جاتی ہے۔32 اس لیے سی ایس پی ٹیکنالوجی جہاں پر کاربن اخراج کم کرتی ہے وہاں پر پانی کی زیادتی کے حوالے سے موزوں نہیں۔

فوٹو وال ٹیٹک سولر سیلز کی صنعت کئی طرح کے کیمیائی اخراج کرتی ہے۔ ان کیمیائی اشیاء کے مختلف ممکنہ اثرات کی بھی نشاندہی کی جارہی ہے۔ لیکن کیونکہ ٹیکنالوجی بالکل نئی ہے اس لیے ابھی تک تحقیق کی کمی پائی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر سولر پینلز کی زندگی 30-25 سال کہی جارہی ہے اور ظاہر ہے کہ ابھی تک یہ اتنی تعداد میں ضائع نہیں ہوئے کہ ان کے اثرات کے بارے میں اعداد و شمار حاصل ہوں۔33 کچھ سائنس دانوں کا خیال ہے کہ یہ ٹیکنالوجی زمین کے استعمال، پانی کے استعمال، مضر کیمیائی اشیاء کے استعمال اور مختلف آلہ جات کی تیاری کے دوران ہونے والے گرین ہاؤس گیسیز کے اخراج کے حوالے سے مسائل پیش کرتی ہے۔34

شمسی توانائی کے لیے سولر پینلز کو لگانا اور اس کے صحیح استعمال کا انحصار تکنیکی معلومات کا تقاضہ کرتا ہے۔ اس کے استعمال میں تمام شراکت داروں کی سوجھ بوجھ کا اہم تعلق ہے۔ اگر اس ٹیکنالوجی کو سمجھداری سے استعمال نہیں کیا گیا تو یہ دیرپا ثابت نہیں ہوگی۔35 دوسرے لفظوں میں پڑھا لکھا ہنر مند طبقہ ہی اس ٹیکنا لوجی میں روزگار حاصل کر پائے گا۔اس طرح جو سب سے کمزور مزدور طبقہ ہے اس کے لیے روزگار کے مواقع مزید کم ہوجائیں گے۔

فراہم کردہ معلومات کئی طرح کے مسائل سامنے لائی ہے۔ فوری طور پر بڑے جاگیردار اور زمیندار ہی شمسی توانائی استعمال کر پائیں گے اور اس طرح ان کی پیداوار اور دولت میں مزید اضافہ ہوگا۔ اس میں شک نہیں کہ اس متبادل توانائی سے کاربن کے اخراج پر بڑی حد تک قابو پا لیا جائے گا لیکن پانی جیسے اہم ترین قدرتی وسائل جس کی قلت نا صرف پاکستان میں بلکہ دنیا بھر میں بڑھتی جارہی ہے کا بے دریغ استعمال ہوگا۔ ٹیوب ویل کا استعمال پہلے ہی ایک پریشان کن امر تھا اور اب اس نئی ٹیکنالوجی سے اسے مزید فروغ حاصل ہو گا اور یقینی ہے کہ ایک اور طرح کی آفت آئے گی۔ اس کے علاوہ ایک اور پہلو زمین کے استعمال کا ہے۔ گو کہ ٹیوب ویل کے لیے 8-7 کلو واٹ توانائی کے لیے آدھ کنال تک زمین چاہیے لیکن بڑے منصوبوں کے لیے زیادہ زمین چاہیے۔ جیسے جیسے توانائی کے حصول کے لیے سولر پینلز کا فروغ ہوگا ویسے ویسے زیادہ سے زیادہ زمین اس ٹیکنالوجی کو لگانے کے لیے استعمال ہوگی۔

دنیا بھر میں بڑے پیمانے پر کسانوں کو زمین سے بے دخل کیا جارہا ہے۔ اس نئے طرز کے زمینی قبضے کو لینڈ گریبنگ (land grabing) کا نام دیا جارہا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جیسے جیسے کارپوریٹ زراعت کے شعبہ میں شمسی توانائی سے پانی حاصل کرنے کے مسائل حل ہوں گے کارپوریٹ زراعت اپنے پنجے گہرے کرتے ہوئے کئی طرح کی غیر پائیدار، ماحول اور کسان دشمن پالیسی سازی اور طریقہ پیداوار اپنائے گی۔ مثلاً جینیاتی بیج، زہریلی کیمیائی اشیاء پودوں اور فصلوں پر استعمال ہونے والا زہریلا مواد تیزی سے فروغ پائے گا۔ ایک طرف کسان پر قرض کی شرح خطرناک حدوں کو عبور کر کے بے زمینی اور غربت کو فروغ دے گی اور دوسری طرف کیمیائی اور جینیاتی آلودگی پر مبنی غذا بھی عام ہوگی جو حیاتیاتی تنوع کے لیے نہایت نقصاندہ پہلے ہی ثابت ہوچکی ہے۔اس کے علاوہ یہ ٹیکنالوجی بذات خود ماحولیات پر کیا اثر ڈالتی ہے وہ آنے والی دہائیوں میں کھل کر واضح ہوگا۔

یہ واضح کرنا بھی ضروری ہے کہ یہ نئی ٹیکنالوجیاں چاہے وہ شمسی توانائی ہو یا ایتھنول پر چلنے والی گاڑیاں سب ڈبلیو ٹی او کے تحت ٹرپس کے معاہدے کا تحفظ رکھتی ہیں اور بے تحاشہ مہنگی ہیں۔قومی خزانے پر ان نئی ٹیکنالوجیاں کو حاصل کرنے کا بوجھ مزید بڑھ جائے گا۔ یعنی جو رقم قومی فلاح کے لیے استعمال کی جاسکتی تھی وہ اب یورپی اور دیگر دیوہیکل کمپنیوں کی تجوریوں میں جمع ہوگی۔

کیا یہ توانائی مساوات کو پروان چڑھائے گی؟ چھوٹے اور بے زمین کسان کو بڑے زمیندار اپنی مرضی کے دام لگا کر توانائی فروخت کریں گے۔ یعنی ہم یہ کہ سکتے ہی کہ کم از کم شمسی توانائی ایک طرف زمین او رپانی جیسے قدرتی وسائل کا بے دریغ استعمال کرتے ہوئے ناصرف امیر اور غریب ممالک کے درمیان فرق کو بڑھائے گی بلکہ امیر اور غریب کے درمیان بھی فرق کو مزید بڑھائے گی۔ اس میں شک نہیں کہ پانی اور زمین جیسے وسائل جب کم ہوتے جائیں گے تو چھوٹے اور بے زمین کسان کی دسترس سے مزید باہر ہو جائیں گے۔

تو یہ تھیں کچھ حقیقتیں جو کہ متبادل توانائی کے نام پر عوام پر مزید مسائل کے بوجھ کو بڑھانے میں کردار ادا کریں گی۔ آیئے اب آگے چلتے ہیں۔ ایک نظر یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ پچھلے سالوں میں امیر ممالک کی طرف سے کیے گئے وعدوں پر کیا عمل درآمد ہوا ہے؟

2009 میں ہونے والے کوپ 15 کے موقع پر امیر ممالک نے غریب ممالک کو موسمی تبدیلی سے نمٹنے کے لیے سالانہ 100 بلین ڈالرز فراہم کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ جون 2015 میں نیو یارک میں موسمی تبدیلی کے حوالے سے اقوام متحدہ کے ایک اہم اجلاس میں چار غریب ترقی پزیر ممالک (برازیل، بھارت، ساؤتھ افریقہ اور چین) نے مل کر موسمی تبدیلی کے حوالے سے امدادی صورتحال پر ایک تنقیدی بیان پیش کیا کہ امیر ممالک نے 2020 تک 100 بلین ڈالرز سالانہ امداد دینے کے لیے کوئی واضح لائحہ عمل پیش نہیں کیا۔36

اس کے علاوہ 2010 سے 2012 کے دورانیے کے لیے 30 بلین ڈالرز کا وعدہ بھی کیا گیا جسے ''فاسٹ اسٹارٹ فائنس'' کہا جاتا ہے۔ یعنی ''(موسمی تبدیلی کے حوالے سے کام) تیزی سے شروع کرنے کے لیے مالی مدد''۔ آکسفیم کی رپورٹ کے مطابق اس مخصوص مدت میں خطرات سے نمٹنے کے لیے 20 فیصد سے بھی کم امداد فراہم کی گئی ہے۔37

دوسرے لفظوں میں یہ واضح ہے کہ پچھلے سالوں میں ہونے والی پالیسی سازی پر ابھی تک تسلی بخش عملی قدم نہیں اٹھائے گئے ہیں اور اب اس سال دسمبر

(2015) میں کوپ 21 جو کہ پیرس، فرانس میں منعقد ہوگا، میں ایک نئے معاہدے پر دستخط کیے جائیں گے۔

نیا معاہدہ جو پیرس میں دسمبر 2015 میں کیا جائے گا، موسمی تبدیلی کے حوالے سے پہلا بین الاقوامی معاہدہ ہوگا جو ترقی یافتہ اور ترقی پزیر ممالک دونوں پر اخراج کم کرنے کے لیے لاگو ہوگا۔ یہ نقطہ اہم ہے کہ اس معاہدے کے ذریعے بھی دنیا کے درجہ حرارت کو صنعتی دور سے پہلے پائے جانے والے درجہ حرارت کی سطح سے دو ڈگری سینٹی گریڈ کم تک محدود نہیں کیا جاسکے گا۔[38] یہ وہ حد ہے جو سائنسی تحقیق کے مطابق دنیا کو مزید موسمی بحران سے ہونے والی آفات سے بچانے کے لیے ضروری ہے۔ اگر زمین کا درجہ حرارت دو ڈگری سیلس سے تجاوز کرے گا تو موسمی بحران میں مزید شدت کے قوی امکان ہیں۔[39] سائنس دانوں کے مطابق سمندر اور زمین کی حدت میں اضافہ کے ساتھ الگ الگ جغرافیائی خطوں میں شدید اثرات ہوں گے ۔ مثلاً کچھ علاقوں میں گرمی سے جنگل میں آگ لگنے کا خطرہ بڑھ جائے گا۔ سمندری طوفان کی شدت میں اضافے کے ساتھ ساتھ ایک طوفان سے دوسرے طوفان تک کا وقفہ تو بڑھ سکتا ہے لیکن نمی میں شدت سے کمی آسکتی ہے۔ اس طرح کبھی شدید طوفان اور کبھی خشک سالی رونما ہوگی۔ کچھ دریاؤں میں پانی کم ہوجائے گا اور اس طرح کئی فصلوں کی پیداوار کم ہوجائے گی۔ سمندروں کی سطح بڑھ رہی اس لیے چھوٹے جزیروں پر مبنی ممالک کو شدید خطرہ لاحق ہوگا۔ ساحلی شہر اور ساحلی تنوع حیات بھی سمندر کی بڑھی ہوئی سطح سے سخت بربادی کا سامنا کررہے ہیں۔

پیرس کلائمٹ کانفرنس یعنی کوپ 21 میں اب بہت تھوڑا وقت رہ گیا ہے۔ اب تک 59 ممالک جن کا کاربن اخراج عالمی اخراج کا 60 فیصد ہے ملکی سطح پر اخراج کم کرنے کے وعدے درج کروا چکے ہیں۔ ان وعدوں سے یہ واضح ہے کہ عالمی حدت دو ڈگری سینٹی گریڈ سے کم کرنا ممکن نہیں ہوسکتا۔[40] دنیا کے سب سے زیادہ کاربن خارج کرنے والے ممالک میں سے امریکہ، چین اور یورپی یونین نے اپنے وعدے درج کروادیے ہیں۔ امریکہ نے رضا مندی ظاہر کی ہے کہ وہ گرین ہاؤس گیسیز میں 2025 تک 2005 کی سطح سے 26-28 فیصد کمی لائے گا۔ چین کا کہنا ہے کہ وہ اخراج کو 2030 تک ایک سطح پر لے آئے گا۔ یعنی 2030 میں جو اخراج ہوگا وہ آئندہ اس حد سے تجاوز نہیں کریں گے۔ یورپی یونین نے 2030 تک 1990 کی سطح سے 40 فیصد کم اخراج کا وعدہ کیا ہے۔ ایک تحقیق کے تحت خیال کیا جارہا ہے کہ اگر ان تین ممالک نے اپنے کیے ہوئے وعدے پورے کیے اور دیگر ممالک جنہوں نے پہلے وعدے کیے ہوئے ہیں، سب کچھ ہوپایا تو دنیا کا درجہ حرارت 3-3.5 ڈگری سینٹی گریڈ تک محدود کیا جاسکے گا۔[41] 2014 میں کوپ 20 کے بعد کوپ 21 سے زیادہ امیدیں رکھنے کا فائدہ نہیں ہے۔ کوپ 21 میں یہ فیصلہ ہوچکا ہے کہ اب ہر ملک اپنی گرین ہاؤس اخراج کم کرنے کی حد کا خود فیصلہ کرے گا۔ ان کو ''انٹینڈیڈ نیشنلی ڈیٹرمائنڈ کونٹری بیوشنز'' (Intended nationally determined contributions) کہا جارہا ہے۔ یعنی ہر ملک یہ ''ارادہ'' فراہم کرے گا کہ وہ اپنے کاربن اخراج کو کس حد تک کم کریں گے''۔ اس ارادے کو ہر ملک یو این ایف سی سی سی کو درج کرائے گا۔[42]

جون 2015 میں بون، جرمنی میں کوپ 21 کے حوالے سے ہونے والے مزاکرات میں ظاہر تھا کہ امریکہ سی بی ڈی آر کو مزاکرات میں شامل کرنے سے کترا رہا ہے کیونکہ سی بی ڈی آر ترقی یافتہ اور ترقی پزیر ممالک کے درمیان واضح لکیر کھینچتا ہے۔[43] (سی بی ڈی آر کی وضاحت مضمون کے شروع میں ریو پرنسپلز یور یو این ایف سی سی سی کے تحت کامن بٹ ڈینزین شی ایٹیڈ ذمہ داریوں کے حوالے سے کردی گئی تھی) امریکہ کے خیال سے یہ تفریق اب ابھرتی ہوئی معیشتوں کی وجہ سے واضح نہیں رہی ہے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ اب تک پہلی دنیا اور تیسری دنیا کے مابین تفریق صرف امداد فراہم کرنے کے وعدوں کو پورا نہ کرنے پر ہے۔ یعنی اگر امیر ممالک گرین کلائمٹ فنڈ کے لیے مالی وسائل نہیں فراہم کرتے تو شاید پیرس میں ہونے والا اجلاس ناکام ہوجائے گا۔[44]

کوپ 21 سے پہلے ہونے والے مزاکرات پر عوامی گروہوں کی شدید تنقید پائی جاتی ہے جو کیوٹو پروٹوکول سے بھی زیادہ کمزور سمجھا جارہا ہے۔ یہ نیا معاہدہ حکومتوں کو پابند کرنے والا لائحہ عمل پیش نہیں کررہا ہے۔ جبکہ یہ معاہدے قانونی طور پر نافذ کرنے کے حوالے سے بنایا جانے والا تھا۔ اس کے علاوہ جنوبی امیر صنعتی ممالک اور شمالی غریب ممالک کے بیچ میں جو تفریق ہے اس کو بھی مبہم کرتا جارہا ہے۔ سی بی ڈی آر کے بنیادی اصول کو ختم کردیا گیا ہے۔ اب لائحہ عمل صرف اخراج کم کرنے پر ہے اور اس کے تحت آئی این ڈی سیز کو رائج کیا جارہا جو کہ رضا کارانہ بنیاد پر طے کیے جارہے ہیں۔ آئی این ڈی سیز کی بنیاد ناانصافی پر ہے، غیر مساوی ہے، سائنسی تجاویز پر مبنی نہیں ہے اور نہ تاریخی طور پر اخراج کی ذمہ داری قبول کررہے ہیں۔[45]

دسمبر 2015 واضح کردے گا کہ کیا آخر کو امیر سرمایہ دارانہ ممالک نے موسمی انصاف پر مبنی لائحہ عمل وضع کیا یا نہیں۔ تاریخ کے بل بوتے یہ لکھنا غلط نہ ہوگا کہ اس کی کوئی امید نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ سرمایہ دارنہ نظام منافع کی بنیاد پر بہت تنگ نظر زاویہ کے تحت فیصلہ سازی کرے گا لیکن کرہ ارض کی برداشت اور عوام کی برداشت دونوں ہی آخری حدوں کو چھوگئی ہے۔

حوالہ جات

1. United Nations Framework Convention on Climate Change. "Timeline - UNFCCC -- 20 years of effort and achievements" UNFCCC 2014. Accessed from http://unfccc.int/timeline/
2. Ibid.
3. United Nations. "Rio declaration on environment and development 1992." United Nations, 1992. Accessed from http://www.jus.uio.no/lm/environmental.development.rio.declaration.1992/portrait.a4.pdf

http://www.climatecentral.org/news/paris-talks-wont-achieve-2-degree-goal-does-that-matter-18648
22. Dean, Judith M., Lovely, Mary E. and Wang, Hua. "Are foreign investors attracted to weak environmental regulations? Evaluating the evidence from China." Journal of Development Economics 90 (2009) 1-13. Accessed from http://siteresources.worldbank.org/DEC/Resources/ForeignInvestors.pdf
23. OECD.Stat. "OECD-FAO Agricultural Outlook 2011-2020:BIOFUEL - OECD-FAO Agricultural outlook 2011-2020." OECD.Stat. Accessed from http://stats.oecd.org/viewhtml.aspx?QueryId=30104&vh=0000&vf=0&l&il=blank&lang=en
24. European Commission. "JRC scientific and policy reports R & D investment in the technologies of the European Strategic Energy Technology Plan."
25. OECD.Stat. "OECD-FAO Agricultural outlook 2011-2020."
26. Kahlown, Muhammad A. (et al). "Determination of crop water requirement of major crops under shallow water-table conditions." Research Report-2 2003, Pakistan Council of Research in Water Resources, Islamabad, 2003, p. 11. Accessed from http://www.pcrwr.gov.pk/Research%20Report/Water%20Management/Dete rmination%20of%20Crop.pdf
27۔ شریف ثنا، ''زراعت سے وابستہ دیہی مزدور عورتوں کی اجرت۔'' جنوری تا اپریل، 2015، چیلینج، صفحہ 15، جلد 8، شمارہ 1۔
28۔ احمد جنید۔ ''چینی کی صنعت کی ترقی: فائدہ کس کا؟''۔ چیلینج، جلد 8 شمارہ 1، جنوری تا اپریل 2015۔
29. Onishi, Norimitsu. "For Philippine family in politics, land issue hits home." March 14, 2010, New York Times. Accessed from http://www.nytimes.com/2010/03/15/world/asia/15phils.html?_r=0
30. Nasir, Mahmood. "Viability of solar energy for tubewells." The DAWN, September 30, 2013. Accessed from http://www.dawn.com/news/1046364
31. Union of Concerned Scientists. "Environmental impacts of solar power." Union of Concerned Scientists. Accessed from http://www.ucsusa.org/clean_energy/our-energy-choices/renewable-energy/environmental-impacts-solar-power.html#bf-toc-1
32. Carter, Nicole, T and Campbell, Richard J. "Water issues of concentrating solar power (CSP) electricity in the U.S. Southwest." Congressional Research Service, 2009. Accessed from http://www.circleofblue.org/waternews/wp-content/uploads/2010/08/Solar-Water-Use-Issues-in-Southwest.pdf
33. Dubey, Swapnil, Jadav, Nilesh Y and Zakirova, Betka. "Socio-economic and environmental impacts of silicon based photovoltaic (PV). Energy Procedia 33 (2013) 322-334, Elsevier Publishers. Accessed from http://ac.els-cdn.com/ S1876610213000830/1-s2.0-S1876610213000830-main.pdf?_tid=75d21dfe-8070-11e5-b558-00000aacb362&acdnat=1446365800_eee3a165e5bee4ab38d91f93d6452ad0
34. Carter, Nicole, T and Campbell, Richard J. "Water issues of concentrating solar power (CSP) electricity in the U.S. Southwest."
35. Nasir, Mahmood. "Viability of solar energy for tubewells."
36. Goldenberg, Suzanne. "Rich countries' $100bn promise to fight climate change 'not delivered.' The Guardian, June 29, 2015. Accessed from http://www.theguardian.com/environment/2015/jun/29/rich-countries -100bn-promise-fight-climate-change-not-delivered

(بقیہ حوالہ جات صفحہ نمبر 43 پر دیکھیں)

4. UNEP and CBD. "Working relationship between the United Nations Framework Convention on Climate Change and the Intergovernmental Panel on Climate Change." Conference on the Parties of the Convention on Biological Diversity, Hyderabad, India, 8-9 October, 2012. Accessed from https://www.cbd.int/.../cop-11-inf-14-6.doc
5. United Nations. "United Nations Framework Convention on Climate Change." United Nations, 1992.Accessed from https://unfccc.int/ files/essential_background/background_publications_htmlpdf/application/pdf/conveng.pdf
6. UNFCCC. " Milestones on the road to 2012: The Cancun Agreements." Accessed from http://unfccc.int/key_steps/cancun_agreements/items/6132.php
7. Berstein, Lenny et al. "Climate Change 2007: Synthesis Report." An Assessment of the Intergovernmental Panel on Climate Change, IPCC, 2007. Accessed from https://www.ipcc.ch/pdf/assessment-report/ar4/syr/ar4_syr.pdf
8. United States Environmental Protection Agency. "Overview of greenhouse gases." EPA 2015. Accessed from http://www.epa.gov/climatechange/ghgemissions/gases.html
9. United Nations. "United Nations Framework Convention on Climate Change." UN 1992. Accessed from https://unfccc.int/ files/essential_background/background_publications_htmlpdf/application/pdf/conveng.pdf
10. Ge, Megpin, Fredrich, Johannes and Damassa, Thomas. "6 graphs explain the World's top 10 emitters." November 25, 2014, World Resources Institute. Accessed from http://www.wri.org/blog/2014/11/6-graphs-explain-world's-top-10-emitters
11. The World Bank. "Data. Population, total." The World Bank Group, 2015. Accessed from http://data.worldbank.org/indicator/SP.POP.TOTL
12. Ministry of Climate Change, Government of Pakistan. "Pakistan intended nationally determined contributions (zero draft)." Ministry of Climate Change, Government of Pakistan, 20??, Accessed from http://www.mocc.gov.pk/gop/index.php?q=aHR0cDovLzE5Mi4xNjguNzAuMTM2L21vY2xjL3VzZXJmaWxlczEvZmlsZS9JTkRDJTIwUEFLSVNUQU4lMjAtemVybyUyMGRyYWZ0LS5wZGY%3D
13. UNFCC. "Fact sheet: the need for mitigation." UNFCC, November 2009. Accessed from https://unfccc.int/files/press/backgrounders/application/pdf/press_factsh_mitigation.pdf
14. Frankel, Jeffrey N. "Greenhouse gas emissions." Brookings Policy Brief Series #50. Accessed from http://www.brookings.edu/research/papers/1999/06/energy-frankel
15. UNFCC. "Fact sheet: the need for mitigation."
16. Climate Policy Info Hub. "Overview of climate targets in Europe." Climate Policy Info Hub. Accessed from http://climatepolicyinfohub.eu/overview-climate-targets-europe
17. European Commission. "JRC Scientific and Policy Reports R & D Investment in the Technologies of the European Strategic Energy Technology Plan." Brussels, May 2, 2013, European Commission. Accessed from https://ec.europa.eu/energy/sites/ener/files/swf_2013_0157_en.pdf
18. Ibid, p. 38.
19. Ibid, p. 72.
20. Climate Policy Info Hub. "Progress towards 2020 green house gas target in Europe." Climate Policy Info Hub. Accessed from http://climatepolicyinfohub.eu/progress-towards-2020-greenhouse-gas-target-europe
21. Upton, John. "Paris talks won't achieve 2°C goal: does that matter?" Feburary 10, 2015, Climate Central. Accessed from

دریا کے کنارے آباد بستیاں اور موسمی بحران

تحریر: ثنا شریف

اس میں کوئی شک نہیں کہ کسی بھی ملک میں دریائی وسائل پانی کے تحفظ اور فطرت کو برقرار رکھنے کے ساتھ انسانی زندگیوں اور ملک کی اقتصادی ترقی کے لیے اہم سمجھے جاتے ہیں اسی لیے صدیوں سے مختلف معاشروں کے دریاؤں سے گہرے روابط رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قدیم تہذیبوں کی باقیات بھی عموماً دریا کے کنارے ہی ملتی ہیں۔ دریا کنارے آباد بستیاں اپنی خوراک، رہائش اور بقاء کے لیے ان دریائی وسائل پر انحصار کرتی آئی ہیں۔1

دی ایکسپریس ٹریبیون میں دریائی بحران پر چھپنے والے ایک مضمون کے مطابق دنیا میں بے شمار دریا اس وقت بحرانوں کا شکار ہیں۔2 آلودگی کی مختلف اشکال نے دریائی پانی کے معیار کو متاثر کرنے کے علاوہ بڑے ڈیموں کی تعمیر نے ان دریاؤں کی فعالیت اور ارتقائی عمل پر بھی اثر ڈالا ہے۔ دنیا کے تقریباً دو تہائی دریا گزشتہ صدی میں تعمیر کیے گئے پچاس ہزار ڈیموں سے نقصان اٹھا چکے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ صحت مند اور صاف ستھرے بہتے دریا ہماری دنیا کی بقاء کے لیے بہت ضروری ہیں کیونکہ ان سے ہمیں جہاں پانی، خوراک، قدرتی ادویات، تعمیراتی مواد، ریت، جہاز رانی، تفریحی اور ثقافتی سہولتیں میسر ہوتی ہیں وہی ان دریاؤں کا پانی سیلاب اور خشک سالی کے اثرات کو کم کرتا ہے اور جنگلات، زمین، پانی کی فراہمی، ماہی گیری سمیت دیگر معاشی ذرائع کو پائیدار رکھنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ دریا کے آخری سرے پر جہاں تازہ پانی سمندر کے نمکین پانی میں شامل ہوتا ہے وہ حصہ کرہ ارض کے سب سے زیادہ زرخیز پیداواری علاقوں میں شمار کیا جاتا ہے جسے عام طور پر ڈیلٹا کہتے ہیں۔ ان علاقوں میں ایسی جنگلی جھاڑیاں اور آبی حیات پائی جاتی ہیں جو عام طور سے نمکین پانی میں افزائش پاتی ہیں اس طرح کے علاقے مینگروز (Mangroves) کہلاتے ہیں۔ پاکستان بھی مینگروز کی دولت سے مالا مال ہے۔ دریائے سندھ کے یہ مینگروز دنیا میں منفرد حیثیت رکھتے ہیں۔ بدقسمتی سے موسمی تبدیلی کے سبب 1978 سے لے کر 2001 تک ساحلی جنگلات میں 16.5 فیصد کمی دیکھنے میں آئی ہے۔3 مینگروز کا انحصار دریا کے تازہ پانی پر ہوتا ہے۔ ساحلی جنگلات اور ان میں پنپنے والی آبی حیات کو میٹھے پانی کی مخصوص مقدار کی ضرورت ہوتی ہے۔ اب ان مینگروز کو نمکین سمندری پانی میں اضافے کے نتیجے میں خطرے کا سامنا ہے کیونکہ تازہ پانی کی تھوڑی مقدار ہی اب سمندر تک پہنچ پاتی ہے۔ ورلڈ بینک کے مطابق تازے پانی کی کمی کے سبب دریائے سندھ کے ڈیلٹا میں 3450000 ہیکٹر رقبے پر پھیلے ہوئے یہ مینگروز اب 160,000 سے 200,000 ہیکٹر تک رہ گئے ہیں۔4

ماضی میں جن دریاؤں کو وسائل کے حوالے سے اہم سمجھا جاتا تھا وہی اب موسمی تبدیلیوں اور دریاؤں پر ڈیم، پل اور دیگر تعمیرات کے سبب شہروں اور دریا کے قریب بسنے والی مقامی آبادیوں کے لیے خطرہ بنتے جا رہے ہیں۔ پچھلے پچاس سالوں میں ان دریاؤں میں آلودگی، پانی کے زائد اخراج اور ان کے بہاؤ کے رخ تبدیل ہونے کی وجہ سے کئی بستیاں صفحہ ہستی سے مٹ چکی ہیں۔

عالمی سطح پر موسمی تبدیلی

گزشتہ عشروں میں موسمی تبدیلی کے اثرات ہمیں سطح سمندر کے بلند ہونے، متواتر آنے والے طوفان، سیلاب، خشک سالی، بارشوں کے بے ربط سلسلے اور درجہ حرارت تیزی سے بڑھنے کے سبب برف کے پہاڑوں کے پگھلنے کی صورت نظر آتے ہیں۔

یہ بات یقینی ہے کہ موسمی تبدیلی گزشتہ دہائیوں میں قدرتی معاملات میں انسانی مداخلت اور ترقی یافتہ ممالک میں بڑھتی ہوئی صنعتی آلودگی اور گرین ہاؤس گیسیس کے اخراج کا نتیجہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کا درجہ حرارت گزشتہ صدیوں کے مقابلے تیزی کے ساتھ بڑھتا دکھائی دے رہا ہے۔ پچھلے ڈیڑھ سو سالوں کے دوران دنیا کے درجہ حرارت میں 0.76 ڈگری سینٹی گریڈ اضافہ دیکھا گیا جبکہ 1955 سے 2005 کے درمیان درجہ حرارت میں 1.22 ڈگری سینٹی گریڈ تک اضافہ ہوا۔ اقوام متحدہ کے موسمی تبدیلیوں سے متعلق سائنسی تحقیق اور تکنیکی معلومات کی جانچ کرنے والے ادارے آئی پی سی سی (Intergovernmental Panel on Climate Change/IPCC) کی چوتھی تجزیاتی رپورٹ 2007 کے مطابق آنے والی صدیوں میں عالمی درجہ حرارت کی اوسط سطح 1.4 سے 5.8 عشاریہ تک بڑھ سکتی ہے5 جس کے اثرات شدید نوعیت کے طوفانوں اور سیلابوں کی صورت دیکھے جاسکتے ہیں۔ یہ موسمی تبدیلیاں ہمیں ایک خطے میں دوسرے خطے سے مختلف نظر آتی ہیں۔ خاص کر ایشیائی خطے میں موسلا دھار بارشوں اور سیلاب کے واقعات میں اضافہ اور کچھ علاقوں کو متواتر خشک سالی کا سامنا رہتا ہے جس کے نتیجے میں بڑے پیمانے پر بنیادی ڈھانچے کی تباہی اور انسانی نقل مکانی دیکھنے میں آئی ہے۔ آئی پی سی سی کی رپورٹ کے مطابق 1970 کے بعد جنوبی ایشیاء میں آنے والے طوفانوں کی تعداد میں مسلسل اضافہ دیکھنے میں آیا ہے۔6

وسطی ایشیاء میں درجہ حرارت بڑھنے کی وجہ سے بڑے بڑے برف کے تودے تیزی سے پگھل رہے ہیں جس سے وسطی ہمالیہ اور پاکستان کے شمالی علاقہ جات میں برفانی تودے گرنے کے باعث مصنوعی جھیلوں کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے۔ تقریباً 2,420 برفانی جھیلوں میں سے 55 جھیلیں ایسی ہیں جن کے پھٹ جانے سے

کسی بھی وقت بڑے پیمانے پر انسانی جانیں ضائع ہوسکتی ہیں اور زراعت سمیت بنیادی ڈھانچے بڑی تباہی کا شکار ہوسکتے ہیں۔[7]

ان موسمی تبدیلیوں کے نتیجے میں آب و ہوا اور مقامی معیشت کو بڑے پیمانے پر نقصان ہوتا ہے۔ دریا کے کنارے آباد بستیوں کے روزگار کا زیادہ تر انحصار مقامی وسائل پر ہوتا ہے۔ موسمی بحرانوں سے ہونے والی بربادی ان آبادیوں خاص کر کسانوں پر طویل المدت اثرات چھوڑتی ہے۔

پاکستان کا دریائی نظام اور موسمی خطرات

پاکستان کا دریائی نظام 60 سے زائد چھوٹے اور بڑے دریاؤں پر مشتمل ہے۔ دریائے سندھ کا شمار پاکستان کے سب سے اہم اور طویل ترین دریا میں کیا جاتا ہے۔ دریائے سندھ کی مجموعی لمبائی 3,200 کلو میٹر اور ایک اندازے کے مطابق اس دریا کا سالانہ بہاؤ 207 بلین کیوبک میٹر ہے۔[8] پاکستان میں بہنے والے دیگر دریاؤں میں جہلم، چناب، راوی، ستلج اور دریائے کابل شامل ہیں۔ دریائے سندھ، جہلم اور چناب مغربی دریا کے نام سے جانے جاتے ہیں جبکہ دریائے راوی، ستلج اور بیاس مشرقی دریا کہلاتے ہیں۔ ملک میں بہنے والے ان پانچ دریاؤں کے ذریعے میدانی علاقوں میں کئی چھوٹی ندیاں وجود میں آتی ہیں۔ دریاؤں کا یہ سلسلہ تبت اور کیلاش کے پہاڑوں سے شروع ہو کر شمال اور جنوب سے گزرتے ہوئے تمام دریاؤں کا پانی جمع ہو کر آخر میں بحیرہ عرب میں جا ملتا ہے۔ پاکستان کے بڑے تمام دریا ہمالیہ، قراقرم اور ہندوکش کے شمالی پہاڑوں سے لے کر دریائے سندھ تک 0.6 ملین مربع کلومیٹر کے علاقے پر محیط ہیں۔ دریائے سندھ کا آبپاشی نظام دنیا کے بہترین آبپاشی کے نظاموں میں سے ایک مانا جاتا ہے جس سے پورے ملک میں 42 ملین ایکڑ اراضی سیراب ہوتی ہے۔[9]

پاکستان جنوبی ایشیاء میں سب سے زیادہ سیلاب سے متاثرہ ممالک میں سے ایک ہے۔ دریاؤں میں آنے والے سیلاب کے نتیجے میں سندھ اور پنجاب میں سالانہ بنیادوں پر ہونے والے نقصانات کے علاوہ دریاؤں کے قریب رہائشی آبادیوں کو بھی شدید خطرات لاحق رہتے ہیں۔[10]

1947 سے اب تک پاکستان کو 22 بڑے سیلابوں کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ یہ سیلاب 1950، 1957، 1976، 1978، 1988، 1992، 1994، 1995، 2010، 2011، 2012، 2013 اور 2014 میں آئے جن میں سے 2010 کے سیلاب کی شدت بہت زیادہ تھی۔ مجموعی طور پر پاکستان کو گزشتہ 60 سالوں (1950 تا 2009) میں 20 کھرب روپے کے مالی نقصان کے علاوہ 8,887 افراد کی ہلاکت کی صورت جانی نقصان بھی ہوا۔[11] ماہرین کے مطابق 2010 میں مون سون کی غیر متوقع موسلادھار بارش گزشتہ 80 سالوں میں آئے بدترین سیلاب کی وجہ بنی۔ ان بارشوں کے نتیجے میں مغربی دریاؤں میں پانی کے تیز بہاؤ کی وجہ سے گلگت بلتستان سمیت دریائے سندھ کے آخری علاقوں تک تباہی دیکھی گئی۔ 2010 میں آنے والے سیلاب سے 10 کھرب روپے کے مالی نقصان اور 2,000 افراد کی اموات سمیت 17,553 دیہات کو نقصان پہنچا۔[12] سرکاری اعلامیے کے مطابق اس سال ہونے والی غیر معمولی تیز بارشوں کے اثرات گلگت بلتستان، خیبر پختون خواہ اور بلوچستان کے پہاڑی اضلاع میں محسوس کیے گئے۔ پانی کے تیز بہاؤ اور مٹی کے تودے گرنے کے نتیجے میں دیہات میں فصلیں اور بنیادی ڈھانچے تباہ ہوئے اور 18 ملین لوگ بے گھر ہوئے۔ دوسری طرف وہ میدانی علاقے جہاں سیلاب کا پانی تیزی کے ساتھ پہنچا لوگوں کی اموات کی بڑی وجہ بنا۔[13]

سیلاب سے بری طرح متاثرہ علاقوں میں زیادہ تر زمین کے ملکیتی حقوق غیر مساوی بنیادوں پر نظر آتے ہیں۔ زیادہ تر دیہی گھرانوں میں زمین پر ملکیتی حقوق رکھنے والوں کا تناسب کم ہے اور زیادہ تر زمینوں پر جاگیردار اور ملک کا نام نہاد اعلیٰ طبقہ قابض ہے۔ سیلاب سے متاثرہ تمام میدانی علاقوں میں ذریعہ معاش سے محروم ہونے والوں اور نقل مکانی کرنے والوں میں بے زمین ہاری اور مزدور شامل تھے۔[14]

کچے کے علاقے سے کیا مراد ہے؟

سندھ میں برطانوی تسلط سے پہلے ہر سال آنے والے سیلاب کا عملی طور پر تخمینہ نہیں لگایا جاتا تھا۔ اس وقت دریا کے کنارے آبادی اور کاشت کاری بھی اتنے بڑے پیمانے پر نہیں تھی جس طرح آج ہے۔ اس وقت جہاں تک دریا کا پانی پہنچتا تھا وہ علاقہ جنگلات پر محیط تھا۔ بعد ازاں لوگوں نے جنگلات کی کٹائی کر کے عارضی بستیوں کی تعمیر کے علاوہ موزوں جگہ پر کاشت کرنا شروع کردی۔ اس وقت کچھ دریائی جنگلات میروں کی شکار گاہوں کے طور پر محفوظ کیے گئے تھے، جو آج کے موجودہ دور میں جنگلات کے طور پر جانے جاتے ہیں۔

انگریزوں نے ہندوستان فتح کرنے کے بعد اس زرخیز زمین سے تجارتی استعمال کے لیے زیادہ سے زیادہ اناج حاصل کرنا چاہا۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے پہلی دفعہ محکمہ جنگلات قائم کر کے اس کا سربراہ کرنل والٹر اسکاٹ کو مقرر کیا جنہیں دریائے سندھ کے پانی کے زرعی استعمال کے حوالے سے جائزے کے بعد تجاویز پیش کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی۔ کرنل اسکاٹ کے مطابق بارشوں کے موسم میں کوہ ہمالیہ اور ہندوکش سے آنے والی پانی کی بڑی مقدار دریا کے بہاؤ میں اضافہ کا سبب تھی۔ لہٰذا اس دریائی پانی کے بہاؤ کو روکنے کے لیے سکھر اور خیر پور پر بیراجوں کے ساتھ قدرتی ذیلی نہروں کی مرمت کی تجویز پیش کی گئی تاکہ پانی کہ اس ذخیرے سے اناج اگانے کے لیے کھیتوں کو سیراب کیا جاسکے۔ دریائی پانی کو قابو کرنے کے لیے دریائے سندھ کے دونوں اطراف 1860 میں پشتے بنانے کا کام شروع کیا گیا جو 1960 میں پایہ تکمیل کو پہنچا۔ ان پشتوں کی تعمیر کے نتیجے میں دور دور تک پھیلے سیلابی علاقے اب

صرف دریا کے دونوں پشتوں کے درمیانی حصے میں رہ گئے جو مقامی زبان میں ''کچے کے علاقے'' کے نام سے جانے جاتے ہیں۔15 بند کی دوسری طرف کے علاقے آنے والے سیلابوں اور نقصانات سے محفوظ رہتے ہیں ان علاقوں کو ''پکے'' کے نام سے جانا جاتا ہے۔

دریائے سندھ کے ساتھ کچے کا تقریباً دو لاکھ ایکڑ کا علاقہ سیلاب سے متاثر ہوتا ہے۔ یہ علاقہ جنگلات، زراعت، ماہی گیری اور مال مویشیوں کی چراگاہوں کے حوالے سے مالا مال سمجھا جاتا ہے۔ سندھ میں کچے کا علاقہ 55,000 ایکڑ سیلابی زرعی زمین جبکہ چھ لاکھ ایکڑ ساحلی جنگلات پر مشتمل ہے۔ ان علاقوں میں آباد لاکھوں افراد اپنے روزگار کے حصول کے لیے لکڑی کی تجارت، ماہی گیری اور کشتی رانی کے شعبے سے وابستہ ہیں۔16 اس کے علاوہ کئی کسان کاشت کاری کے ذریعے بھی اپنا روزگار اور خوراک حاصل کرتے ہیں۔ ان علاقوں میں ایسی زرعی زمین بھی موجود ہے جو جنگلات صاف کر کے قابل کاشت بنائی گئی ہے۔ یہاں کاشت کی جانے والی خریف کی فصلوں میں گنا، مکئی اور سبزیاں جبکہ ربیع کی فصلوں میں گندم، چارہ اور دیگر فصلیں شامل ہیں۔ دریائی علاقوں میں بڑے پیمانے پر کیلے کی کاشت بھی کی جاتی ہے۔ آبپاشی کے لیے دریائی پانی کے علاوہ نشیبی علاقوں میں جمع شدہ پانی بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ آبپاشی کے لئے مستقل پانی کی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے پکے کی طرف قائم نہری نظام سے چھوٹی نہروں اور پائپوں کی مدد سے پانی حاصل کیا جاتا ہے۔ جبکہ پانی کے حصول کے لیے کم گہرے ٹیوب ویل کا استعمال کیا جاتا ہے۔17

دریا کا پانی اگر تین لاکھ کیوسک سے تجاوز کر جائے تو سیلاب کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ سیلاب کے دنوں میں یہ بستیاں خستہ حال نظر آتی ہیں۔ نامناسب پناہ گاہوں، خوراک اور پینے کے پانی کے مسائل، حفظان صحت اور خاص کر شیر خوار بچوں اور ماؤں کو مناسب رہائش اور تحفظ جیسے مسائل پیش آتے ہیں۔ سیلاب کے دنوں میں مقامی آبادیوں کو تعلیمی درسگاہوں اور دریا کے بہاؤ کو روکنے کے لیے تعمیر کیے جانے والے بندوں پر کئی مہینے عارضی قیام کرنا پڑتا ہے۔ ان حالات میں جہاں ان آبادیوں کی بڑے پیمانے پر گھریلو سرگرمیاں متاثر ہوتی ہیں وہیں غربت اور معاشی بدحالی کی ہولناک شکلیں واضح نظر آتی ہیں۔ انٹرنیشنل فوڈ پالیسی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے مطابق موسمی بحرانوں کے عوامل خصوصاً دیہی آبادیوں کی آمدنی میں اتار چڑھاؤ کی بنیادی وجہ ہیں۔18

کچے کے علاقے میں دریائی جنگلات کے رقبے میں اضافہ کے لیے محکمہ جنگلات کی طرف سے پچھلی تین سے چار دہائیوں میں مختلف پالیسیاں لائی گئیں۔ ان پالیسیوں کو پیش کرنے کا مقصد انتظامی امور کی بحالی تھا لیکن وقت کے ساتھ ساتھ ان پالیسیوں اور ان کے تحت دی جانے والی شرائط ایک سیاسی مسئلہ اختیار کرتی گئیں۔ ابتداء میں جو پالیسی لائی گئی اس میں دریائی جنگلات سے تجارتی حیثیت کے تحت فائدہ اٹھانے کی منظوری دی گئی اور اس بات پر زور دیا گیا کہ ایسے درخت لگائیں جائیں جن کی لکڑی ملکی ضروریات کے لیے استعمال کی جائے۔ جنگلات میں کٹائی کی اجازت کے بعد بڑے پیمانے پر غیر قانونی طور پر کٹائی کا رجحان بھی سامنے آیا جس سے یہاں کے مقامی لوگوں کے لیے مویشیوں کے چارے کا انتظام کرنا مشکل تر ہوتا گیا۔

اس کے بعد لائی جانے والی پالیسیوں میں چھوٹے کاشت کاروں کو مختلف شرائط پر زمین لیز پر دی گئی جس میں لیز کی پہلے سال کی مدت کے دوران نئے درخت لگانے اور پانی کی کمی کی صورت میں نجی ٹیوب ویل لگانے کی بھی اجازت دی گئی۔ تاہم بعد میں بااثر افراد کے زمین پر قبضوں کے نتیجے میں حکومت کی جانب سے لیز پر پابندی عائد کر دی گئی۔ 1983 میں ملک میں جمہوری حکومت کے خاتمے کے بعد ان پالیسیوں کو ازسرنو جائزہ لیا گیا اور ایک بار پھر نئی پالیسی متعارف ہوئی جس کے تحت کاشت کار کو پانچ سال کے عرصے کے لیے زمین ٹھیکے پر فراہم کرنے کی اجازت دی گئی۔ پہلے تین برس کاشت کار ٹھیکے کی رقم کی ادائیگی کے پابند نہیں تھے۔ تاہم تین برس بعد 150 روپے فی ایکڑ ادا کرنے ضروری تھے۔ لیز کی اس نرم پالیسی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ہزاروں چھوٹے اور بڑے کاشت کاروں نے زمینیں ٹھیکہ پر حاصل کیں۔ غرض کہ 1991 اور 2004 میں محکمہ جنگلات کی ایگرو فاریسٹ پالیسی متعارف کروانے کے کوئی خاطر خواہ نتائج حاصل نہیں ہوئے۔ درحقیقت ان پالیسیوں کے فروغ کا مقصد ہی ملک کے بااثر طبقے کو فائدہ پہنچانا تھا۔19

پیش کردہ مضمون میں ملک کے دریائی علاقوں کے قریب آباد پسماندہ بستیوں کے حالات جاننے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس محدود معلومات کا مقصد یہ جاننے کی کوشش تھی کہ آخر کیوں سال بہ سال موسمی تبدیلی کے نتیجے میں یہ بستیاں خطرے سے دوچار ہیں اور وہ کون سے بنیادی عناصر ہیں جن کی وجہ سے یہ آبادیاں دریا کے قریب رہنے پر مجبور ہیں۔

اس ضمن میں بالائی سندھ کے ضلع گھوٹکی میں کچے کے علاقے کے تین گاؤں عبداللہ میرانی، عبدالرزاق سبزوئی اور حبیب اللہ چاچڑ سے تفصیلات لی گئیں۔ ہر گاؤں میں ایک فوکس گروپ منعقد کیا گیا۔ تین فوکس گروپس میں سے دو مردوں کے ساتھ جبکہ ایک عورتوں کے ساتھ کیا گیا۔ ان فوکس گروپس میں کم سے کم آٹھ اور زیادہ سے زیادہ 15 افراد شامل تھے۔ فوکس گروپ کے علاوہ دو انٹرویوز بھی کیے گئے۔ مضمون میں لوگوں سے حاصل کردہ معلومات کے علاوہ دیگر ویب سائٹس سے حاصل کردہ تحقیقی مضامین اور اخباری جرائد پر بھی انحصار کیا گیا ہے۔

عبداللہ میرانی

گھوٹکی کی تحصیل قادر پور میں واقع گاؤں عبداللہ میرانی دریائے سندھ کے کنارے آباد ہے۔ اس گاؤں کے افراد 30 سے 40 سال سے یہاں رہائش پذیر ہیں۔ گاؤں کے زیادہ تر افراد ماہی گیری کے پیشے سے وابستہ ہیں۔ دریائے سندھ کے کنارے آباد یہ

گاؤں دریا میں آنے والے سیلاب سے براہ راست متاثر ہوتا ہے۔

نقل مکانی

فوکس گروپ کے دوران ایک مقامی بزرگ کسان کا کہنا تھا کہ ''کچھ سالوں سے ہمیں اب بڑے سیلاب کے ساتھ ساتھ تیز بارشوں کی وجہ سے دریا میں پانی بڑھ جانے سے آنے والے چھوٹے سیلاب کا سامنا بھی کرنا پڑ رہا ہے۔ چونکہ ہم دریا کے کنارے آباد ہیں اس لیے ہمیں ہرصورت میں نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ خاص کر بزرگ اور معذور افراد کو سیلاب میں بند تک لے جانا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ کوشش کی جاتی ہے کہ بزرگ اور معذور افراد کو آخر میں لے جایا جائے کیونکہ تیز دھوپ میں وہاں مناسب سایہ دار جگہ نہ ہونے کی وجہ سے لوگوں میں بیماریاں بڑھ جاتی ہیں۔ ہمارے گھر کچے ہوتے ہیں اس لیے دریا میں تھوڑا پانی چڑھ جانے سے بھی ان کو نقصان پہنچتا ہے''۔

کسانوں کا مزید کہنا تھا کہ اگر سیلاب کی شدت کم ہو تو نقل مکانی کی ضرورت نہیں ہوتی کیونکہ تھوڑے پانی کے ساتھ گزر بسر کرنے کی عادت ہوگئی ہے۔ اگر دریا کا پانی ساڑھے تین لاکھ کیوسک تک بھی ہو تو نقل مکانی نہیں کرنی پڑتی لیکن پانی چار لاکھ کیوسک سے تجاوز کر جائے تو لوپ بند پر جو گاؤں سے تقریباً آدھے کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے، جا کر بیٹھنا پڑتا ہے۔ یہ عام خیال ہے کہ اب ہر چھ ماہ بعد سیلاب کا سامنا تو کرنا ہی ہے اس لیے گاؤں کے زیادہ تر افراد دریا میں پانی کے اضافہ کے ساتھ ہی پندرہ بیس دن پہلے لوپ بند پر جا کر رہنے کے لیے جھونپڑیاں اور مال مویشیوں کے چارے کا انتظام کر لیتے ہیں۔ گاؤں والوں کو سیلاب آنے کی اطلاع زیادہ تر ریڈیو ایف ایم کے ذریعے ملتی ہے۔ اس گاؤں میں تقریباً 250 گھر آباد ہیں اور سیلاب کے دنوں میں سارا گاؤں ہی دو سے ڈھائی مہینے تک عارضی پناہ گاہوں میں رہتا ہے۔

روزگار

ماہی گیری کے پیشے سے متعلق گاؤں والوں نے بتایا کہ سیلاب کے دنوں میں پانی کے تیز بہاؤ میں مچھلیاں پکڑنے کا کام رک جاتا ہے کیونکہ ان دنوں مچھلیاں گہرائی میں چلی جاتی ہیں۔ یہاں دو سے تین لوگوں کے پاس اپنی بیڑی (کشتی) ہے جو سیلاب کے دنوں میں لوگوں کو لانے لے جانے کے کام بھی آتی ہے۔ گاؤں کے زیادہ تر لوگ ان دنوں مال مویشیوں کا دودھ فروخت کرکے گزارہ کرتے ہیں جو بند پر موجود لوگوں کے علاوہ پکے کی طرف بھی فروخت کیا جاتا ہے۔ سیلاب کے دنوں میں گاؤں کے افراد منڈی کے سیٹھوں سے راشن قرض بشرط سود لینے کے لیے مجبور ہوتے ہیں۔ یہ قرضہ فصل اترنے کے بعد ادائیگی کی طے شدہ مدت جو کم سے کم چھ ماہ اور زیادہ سے زیادہ ایک سال تک ہوتی ہے، کے لیے دیئے جاتے ہیں۔ پانچ ہزار کی رقم پر ہزار سے پندرہ سو روپے سود دینا پڑتا ہے۔ سیٹھ کے علاوہ گاؤں کے لوگ پکے کی طرف کے دکانداروں سے سیلاب کے دنوں میں گندم ادھار لیتے ہیں۔ 90 کلو گندم کی بوری جس کی قیمت 3,000 روپے ہوتی ہے انہیں سیلاب میں 4,500 روپے میں خریدنی پڑتی ہے۔ ایسے گھرانے جو ماہی گیری کے پیشے سے وابستہ بھی نہیں ہیں اور ان کی زمینیں بھی دریا میں ڈوب گئیں وہ پکے کی طرف ٹھیکے پر زمین لے کر کھیتی باڑی کرتے ہیں۔ پکے کی طرف عام طور سے جو زمین منڈی کے قریب ہو اس کی ٹھیکہ کی رقم 30-25 ہزار سالانہ ہوتی ہے اور اگر زمین دریا کے قریب ہو تو ٹھیکہ کی رقم 22 ہزار تک وصول کی جاتی ہے۔

ایک اور بزرگ کسان نے بتایا کہ ان کے آباؤ اجداد ماہی گیری کے پیشے سے وابستہ تھے اس لیے وہ ہمیشہ سے دریا کے کنارے ہی آباد رہے ہیں۔ ایک کسان کا کہنا تھا کہ ''پکے کی طرف اب زمینیں بہت مہنگے داموں دستیاب ہیں ہمارے پاس یہاں رہنے کو جو زمین بچی ہے ہم اس سے بھی ہاتھ نہ دھو بیٹھیں کیونکہ کہیں اور زمین لینے کے لیے ہمارے پاس وسائل نہیں ہیں۔ اگر حکومت ہمیں پکے کی طرف زمین اور روزگار فراہم کرے تو ہم وہاں جا کر بس جائیں۔ پہلے ہماری زندگی اتنی مشکل نہیں تھی، دریا کا پانی صاف تھا، اپنی زمین تھی لیکن اب تو ہم خود ہاتھ پھیلانے کے در پر ہیں۔ جو دریا ہمیں خوراک اور روزگار دیتا رہا ہے اس سے اب ہماری جانیں اور گھر بار محفوظ نہیں رہے ہیں''۔

فصلوں پر اثرات

2010 کے سیلاب سے پہلے یہاں کئی طرح کی سبزیاں، مونگی، کدو، چارے کے علاوہ کپاس اور مونگ پھلی بھی کاشت کی جاتی تھیں۔ لیکن اب بچ جانے والی زمینوں پر صرف ٹینڈے، مرچیں اور گندم ہی کاشت کر پاتے ہیں۔ اب کوشش کی جاتی ہے کہ ایسی فصلیں لگائیں جو دو سے ڈھائی ماہ کے اندر تیار ہو جائیں تا کہ دریا کا پانی چڑھنے سے پہلے ان کو اتار لیا جائے۔ 2010 کے سیلاب سے پہلے یہاں چاول بھی کاشت کیا جاتا تھا۔ لیکن سیلاب کا پانی آنے کے بعد زمین میں سیم آگئی ہے جس کی وجہ سے اب زیادہ تر گنا کاشت کیا جاتا ہے۔

''سیلابی پانی اگر وقت پر اتر جائے تو بھی زمین میں باقی نمی کی وجہ سے فصل کاشت نہیں کی جاسکتی۔ ایسی صورت میں پھر جانوروں کے چارے کے لیے صرف جوار، جنتر ہی لگا دیا جاتا ہے۔ زمین خالی رہنے سے بہتر ہے کہ چارہ کاشت کرکے کسان اپنے نقصان کا کچھ ازالہ کر لیں کیونکہ جب تک زمین خشک نہیں ہوتی اس میں کسی قسم کی غذائی فصل کی کاشت ممکن نہیں ہوتی''۔

اس گاؤں کے قریب کاری ڈنڈ نام کی نہر ہے جس کا پانی یہ لوگ کاشت کاری کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ اس سال جولائی کے وسط میں دریا کے پانی میں اضافے سے اس نہر کا پانی کھیتوں میں آجانے سے کدو، توری اور چھ ایکڑ زمین پر

مرچوں کی فصل تباہ ہوگئی۔ جس کسان کی زمین تھی اس کے مطابق ابھی مرچوں کی دو چنائیاں باقی تھی کہ پانی سے ساری فصل تباہ ہوگئی۔

موسمی تبدیلی کے حوالے سے کسانوں کا کہنا تھا کہ پہلے بارشیں موسم کے مطابق ہوتی تھیں لیکن اب بے موسم بارشوں سے بھی فصلوں کو نقصان پہنچتا ہے۔

زمین پر اثرات

ایک کسان کا کہنا تھا کہ 2010 کے سیلاب نے ان کی زندگیوں کو یکسر بدل کر رکھ دیا۔ پہلے یہ گاؤں غوث بخش مہر کے نام سے جانا جاتا تھا۔ گاؤں کے لوگ ماہی گیری سے روزگار حاصل کرتے تھے۔ اس کے علاوہ تھوڑے رقبے کی زرعی زمینوں کی بھی ملکیت رکھتے تھے۔ لیکن 2010 میں آنے والے سیلاب سے دریا کا رخ مڑنے اور زمین کے کٹاؤ کے سبب یہ گاؤں دو حصوں میں تقسیم ہوگیا جس سے گاؤں کے متعدد لوگوں کی ایک جریب سے آدھے جریب تک زمین اور گھر دریا کی نظر ہونے کے ساتھ 6-5 افراد کی جانیں بھی گئیں۔ کٹاؤ کے سبب دوسرے حصے پر رہ جانے والے گاؤں کا کچھ حصہ ابھی بھی غوث بخش مہر کے نام سے جانا جاتا ہے جبکہ بچ جانے والے دوسرے حصے کی کچھ زمین کو یہاں کے لوگوں نے رہنے اور تھوڑے پیمانے پر کاشتکاری کے لیے دوبارہ آباد کیا ہے۔

مال مویشیوں پر اثرات

2010 کے سیلاب سے پہلے گاؤں میں زیادہ تر لوگوں کے پاس اپنے مال مویشی موجود تھے۔ مال مویشیوں کا چارہ یہ اپنی زمینوں کے کچھ حصوں پر کاشت کرتے تھے لیکن سیلاب میں گاؤں کے زیادہ تر لوگوں کے مال مویشی بہہ گئے یا ضرورت کے تحت فروخت کر دیئے گئے۔ اب گاؤں میں زیادہ تر لوگ حصے پر جانور پالتے ہیں۔ یہ جانور قریبی گاؤں کے رشتہ داروں اور دوسرے زمینداروں سے لیے جاتے ہیں۔ ان جانور سے پیدا ہونے والے بچوں میں سے ایک ان کی ملکیت ہوتا ہے۔ جانور کے دودھ کا استعمال اور اس کو چارہ دینا بھی انہی لوگوں کے ذمہ ہوتا ہے۔ پہلے یہاں حصے پر جانور پالنے کا رواج نہیں تھا۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ اپنی زمینیں ختم ہونے سے جانوروں کے چارے کا بہت مسئلہ ہوگیا ہے اور کوشش کی جاتی ہے کہ گندم اور گنے کی کٹائی کے وقت بھوسہ زیادہ سے زیادہ جمع کر لیا جائے۔

امداد

سیلاب کے دنوں میں آنے والی امداد کے بارے میں لوگوں کا کہنا تھا کہ اس وقت جو نفسا نفسی کا عالم ہوتا ہے اس کی وجہ سے کسی کو امداد پہنچ پاتی ہے اور کسی کو نہیں۔ بند پر جا کر پناہ لینے والے لوگوں کو سیلاب کے کچھ دنوں تک پکا ہوا کھانا ملتا ہے۔ عام طور سے کسان آبادیاں بازار کے کھانے کی عادی نہیں ہوتیں۔ ایک کسان کا کہنا تھا کہ ''پکے ہوئے ملنے والے کھانے میں چاول کی مقدار زیادہ ہوتی ہے جس سے ہم لوگوں کا پیٹ نہیں بھرتا اور اکثر بھوکے رہ کر ہی گزارہ کرنا پڑتا ہے''۔ کھانے کے علاوہ اکثر بند پر تمبو بھی لگا کر دیئے جاتے ہیں۔ زیادہ تر کسانوں کا کہنا تھا کہ عام طور سے ایسے متاثرین جو اسکولوں میں ٹھہرائے جاتے ہیں حکومت ان کی امداد زیادہ کرتی ہے۔ ایک کسان کا کہنا تھا کہ ''ہم خود اگا کر کھانے والے لوگ اب یہ خوراک ہم دوسروں سے بھیک کی صورت میں لیتے ہیں اس سے بڑھ کر ہمارے لیے اور برا کیا ہوسکتا ہے''۔

عبدالرزاق سبزوئی

تحصیل قادر پور کا گاؤں عبدالرزاق سبزوئی بھی دریائے سندھ میں آنے والے چھوٹے اور بڑے سیلابوں سے متاثر ہوتا ہے۔ 30 سے 35 گھرانوں پر مشتمل یہ گاؤں دریا کے شمال کی جانب کندھ کوٹ کی طرف آباد تھا۔ 1992 میں سیلاب آیا تو دریا کے کٹاؤ کی وجہ سے ان کا گاؤں پانی میں چلا گیا۔ جس زمین پر اب یہ گاؤں آباد ہے پہلے حکومت کی طرف سے بند بنانے کے لیے مختص کی گئی تھی لیکن بعد میں بنائے جانے والے نقشوں سے اس زمین کو بند کے لیے خارج کردیا گیا۔ عبدالرزاق سبزوئی کے مکین 1992 کے بعد سے گھوٹکی کے کچے کے علاقے میں آباد ہیں۔

نقل مکانی

نقل مکانی کے حوالے سے ایک کسان کا کہنا تھا کہ چونکہ یہ گاؤں بند کی جگہ پر بنایا گیا ہے اس لیے سطح زمین سے زیادہ اونچائی پر واقع ہے۔ اگر دریا کا تھوڑا پانی بڑھ جائے تو نقل مکانی نہیں کرتے لیکن اگر دریا میں ساڑھے سات لاکھ کیوسک پانی ہو تو لوپ بند پر جا کر کم سے کم 20 دن سے ایک مہینہ تک رہنا پڑتا ہے۔ لوپ بند اس گاؤں سے آدھے کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ دریا میں اتنے پانی کی آمد پر غلہ اور جانور پہلے ہی لوپ بند پر پہنچا دیئے جاتے ہیں کیونکہ گاؤں کے قریب کا سارا علاقہ پانی میں ڈوب جاتا ہے۔ کوشش کی جاتی ہے کہ بچوں اور عورتوں کو بند پر عارضی چھپر بنانے کے بعد لے کر جایا جائے۔ 2010 کے سیلاب میں پانی ہمارے گھروں کے اندر تک پہنچ گیا تھا۔ سیلاب سے علاقے میں بڑی تباہی آئی، گاؤں کے متعدد گھروں سمیت، مال مویشی اور غلہ بھی دریائی پانی کی نظر ہوگیا تھا۔

روزگار پر اثرات

گاؤں کے زیادہ تر لوگ کاشت کاری کے پیشے سے وابستہ ہیں۔ 2010 اور 2013

کے سیلاب میں دریائی کٹاؤ کے سبب گاؤں کے بیشتر افراد کی زرعی زمین دریا میں چلی گئی۔ ان زمینوں پر یہ لوگ چاول، کپاس، وتر (ککڑی)، مونگ، رائی اور بڑے پیمانے پر مونگ پھلی بھی کاشت کرتے تھے لیکن اب صرف مٹر، گندم اور چنا ہی کاشت کر پاتے ہیں کیونکہ یہ فصلیں سیلاب سے پہلے ہی اتر جاتی ہیں۔ جب دریا کا کٹاؤ ہوا تو پانی کے ساتھ ریت کی بڑی مقدار بھی زمینوں پر آئی جس کی وجہ سے بچ جانے والی زمینیں بھی قابل کاشت نہیں رہیں۔ کسانوں کا کہنا تھا کہ وہ اپنی زمین کی خود مختاری سے پرائی مزدوری کرنے پر مجبور ہوگئے ہیں۔ ایک اور کسان کا کہنا تھا کے ’محتاجی اور قرض کے سود نے ہمیں کہیں کا نہیں چھوڑا ہے‘‘۔

گاؤں کے بیشتر افراد زمینوں کے دریا برد ہونے کے بعد اب کچے کی طرف مقامی سردار کی زمین پر آدھے حصے کی بنیاد پر کاشت کرتے ہیں۔ (آدھے حصے سے مراد ہے کہ زمین کی تیاری، کھاد ادویات اور پانی پر خرچ کا آدھا حصہ مالک اٹھائے اور آدھا ہاری۔ اسی لیے پیداوار میں آدھا حصہ مالک کا ہوگا اور آدھا حصہ ہاری کا)۔

اس کے علاوہ کچھ افراد اب زرعی مزدور کی حیثیت سے گنے کی کٹائی اور کچھ خیر پور کی طرف کھجیاں اتارنے کا کام کرتے ہیں۔ یہ کام ایک سے ڈیڑھ مہینے تک چلتا ہے۔ اس عرصے میں مزدوری پر جانے والے مرد وہیں رہتے ہیں جہاں انہیں دو وقت کا کھانا اور چار سو روپے دیہاڑی دی جاتی ہے۔

زمین پر اثرات

ایک بزرگ کسان کے مطابق پہلے دریا کے کنارے آباد علاقے خوراک، موسم اور روزگار کے حوالے سے خوشحال سمجھے جاتے تھے۔ یہاں کی زمین بہت زرخیز تھی۔ سخت گرمیوں میں بھی موسم کی شدت کا اندازہ نہیں ہوتا تھا۔ فصلوں کی کاشت پر کم محنت اور خرچ کے ساتھ پیداوار اچھی ہوتی تھی۔ لیکن اب سیلابوں نے یہاں کی زمین کو بھی خراب کردیا جس سے کچے کے علاقے میں زرعی زمین اب کوڑیوں کے مول فروخت ہوتی ہے۔ پکے کی طرف ایک ایکڑ زمین 17-16 لاکھ میں فروخت ہوتی ہے، وہی زمین کچے میں 8-7 لاکھ میں فروخت ہوتی ہے۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ اگر وہ کچے کے علاوہ کہیں اور جا کر آباد ہونا بھی چاہئیں تو ان کی اتنی مالی حیثیت نہیں کہ پکے کی طرف جا کر رہائش اور زرعی زمین کا خرچہ اٹھا سکیں۔

مال مویشیوں پر اثرات

2010 کے سیلاب میں گاؤں کے متعدد لوگوں کے مال مویشی دریا میں بہہ گئے تھے۔ ایک کسان کا کہنا تھا کہ ’’اس سیلاب کے بعد ہم نے سیکھا کہ سیلاب کا پانی آنے سے پہلے ہی مال مویشیوں کو محفوظ جگہ پر پہنچا دینا چاہیئے۔ اس وقت سیلاب کے ساتھ طوفانی بارش بھی تھی اس لیے سمجھ ہی نہیں سکے کے کیا چیز بچائیں اور کیا نہیں‘‘۔ ایک اور کسان نے بتایا کہ ’’اس وقت جو مال مویشی بچ گئے تھے ان کے چارے کا بہت مسئلہ تھا کیونکہ کچے کا تو تمام علاقہ پانی میں ڈوبا تھا اور پکے کی طرف جانوروں کا چارہ آسانی سے مل نہیں رہا تھا تو جانوروں کے چارے کے حوالے سے بہت مسائل تھے‘‘۔ گاؤں والوں کا کہنا تھا کہ بچ جانے والے مال مویشیوں میں سے بھی کچھ جانور مناسب دیکھ بھال نہ ہونے اور بیماری کی وجہ سے مر گئے۔ اب تمام گاؤں کی کوشش ہوتی ہے کہ پہلے لوپ بند پر جا کے جانوروں کا چارہ محفوظ کرلیا جائے تا کہ سیلاب آ بھی جائے تو کم از کم ان کا دودھ فروخت کر کے روز کا خرچ پورا کیا جائے۔

امداد

سیلاب کے دنوں میں آنے والی امداد کے بارے میں لوگوں کا خیال تھا کہ امداد صرف وقتی طور پر سہارا دیتی ہے جبکہ ان آبادیوں کو مستقل ان حالات کا سامنا رہتا ہے۔ ایک کسان کا خیال تھا کہ ’’ ہم کو امداد فراہم کرنے سے ان لوگوں کا مفاد جڑا ہوتا ہے۔ حکومتیں ووٹ کی خاطر ہمیں استعمال کرتی ہیں۔ اس صورتحال میں آنے والے امداد کی اہمیت بھی بے معنی سی ہوتی جارہی ہے‘‘۔ 2013 کے سیلاب کے بعد حکومت کی طرف سے ایک بیڑی (کشتی) گاؤں کے لوگوں کے لیے دی گئی تھی جس پر سامان رکھ کر بند تک لے جاتے ہیں۔ مستقل سیلاب آنے کی وجہ سے وہ کشتی بھی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوگئی ہے۔

گاؤں کے ان افراد کا حکومت سے مطالبہ تھا کہ وہ دریا کے قریب آباد بستیوں کے لیے کوئی مناسب حکمت عملی اور منصوبہ بندی اختیار کرے۔ کچھ کی رائے تھی کے گاؤں کے کناروں پر سیمنٹ کی محفوظ دیواریں کھڑی کردی جائیں تا کہ نقل مکانی کسی حد تک کم ہو۔

بدلتے موسمی حالات کے حوالے سے کسانوں کا کہنا تھا کہ ’’ پہلے ساون کے موسم میں برسات ہوتی تھی لیکن اب بے موسم بھی برسات دیکھنے میں آتی ہے۔ سردی اور گرمی دونوں کی شدت میں اضافہ ہوا ہے۔ پہلے اس بات کا علم نہیں تھا کہ موسم بدلنے کی وجوہات کیا ہیں لیکن سیلاب کے بعد گاؤں میں آنے والی غیر سرکاری تنظیموں اور ان کے نمائندوں نے ہمیں یہ شعور دیا کہ فضا میں آلودگی بڑھنے سے موسم تبدیل ہورہا ہے۔ ان سب حالات کے پیچھے امیر ممالک کا ہاتھ ہے‘‘۔

گاؤں میں کچھ عورتوں سے انٹرویو کے دوران موسمی تبدیلی کے حوالے سے بات کی گئی زیادہ تر عورتیں موسمی تبدیلی اور بار بار سیلاب آنے کی وجوہات سے لاعلم تھیں۔ انہیں اس بات کا تو اندازہ تھا کہ موسم تبدیل ہورہا ہے پر وجوہات سے لاعلم تھیں۔ عورتوں کا کہنا تھا کہ 2010 کے سیلاب سے پہلے کپاس اور وتر کی مزدوری کرتی تھیں جو زمین نہ ہونے کی وجہ سے اب ختم ہوگئی۔ اب عورتیں گندم اور گنے کی کٹائی

کے لیے گھر کے مردوں کے ساتھ گروہ کی صورت میں جاتی ہیں جس کی اجرت ان کے گھروں کے مرد ہی وصول کرتے ہیں۔ ان کا مزید کہنا تھا کہ بند پر جا کر بیٹھنے سے سب سے زیادہ پریشانی عورتوں کو اٹھانی پڑتی ہے کیونکہ حکومت کچھ دن پکا ہوا کھانا دیتی ہے پھر بند پر نہ تو گھر پکے ہوتے ہیں نہ کھانا پکانے کا صحیح انتظام ہوتا ہے جس میں پکانا بہت تکلیف دہ ہوتا ہے۔ کئی کئی میل جا کر پکے کی طرف سے لکڑیاں کاٹنی پڑتی ہیں اور کپڑے دھونے جانا پڑتا ہے۔ بند پر بیٹھنے والے دنوں میں زیادہ تر عورتیں زمین کی مزدوری نہیں کر پاتیں کیونکہ بند پر بچوں اور سامان کو چھوڑ کر نہیں جایا جاسکتا، ڈر رہتا ہے کہ بچے کہیں دریا کے پانی میں نہ گر جائیں۔

حبیب اللہ چاچڑ

تحصیل قادر پور کا گاؤں حبیب اللہ چاچڑ ان گاؤں میں سے ہے جن کی پوری زمین 2010 کے سیلاب میں دریا میں ڈوب گئی۔ یہ گاؤں پہلے دریا کے شمال کی جانب آباد تھا اس گاؤں کو لوگ یوسف چاچڑ کے نام سے جانتے تھے۔ دریا کے کٹاؤ سے گاؤں میں موجود کسی بھی فرد کی زمین اور گھر نہیں بچ سکا۔ 2010 کے بعد اب یہ گاؤں کچے کے علاقے میں شیک بند کے قریب آباد ہوا ہے۔ گاؤں کے سات سے آٹھ گھرانے ایسے تھے جن کی اپنی زمینیں نہیں تھیں وہ پکے کی طرف نقل مکانی کر گئے۔

اس مضمون کے لیے مواد جمع کرنے کے دوران گاؤں میں موجود مقامی کسان اور استاد سے مفصل انٹرویو کیا گیا۔ جس میں ان کا کہنا تھا کہ ان کی ریونیو ڈیپارٹمنٹ میں اثر و رسوخ اور انتخابات میں ووٹنگ لسٹ کی تیاری کے ذریعے حاصل کردہ معلومات کے مطابق تحصیل گھوٹکی میں کچے کی تقریباً 8-7 ہزار ایکڑ زمین پر لوگ آباد ہیں۔ 1965 کے قریب دریا کے پانی کو روکنے کے لیے ایک بڑا شیک بند بنایا گیا تھا لیکن 1970 میں جب سیلاب آیا تو یہ بند کمزور ہونے لگا۔ لہذا 1975 میں حکومت پاکستان کی منظوری سے ایک اور بند جسے لوپ بند کہتے ہیں بنایا گیا۔ لوپ بند اور شیک بند کے درمیان کی زمین کچے کا علاقہ کہلانے لگی۔

1970 کی دہائی میں ہی جو لوپ بند اور شیک بند کے درمیان زمین تھی وہ حکومت نے لوگوں کو الاٹ کی اس وقت کے کمشنر اور پٹواریوں نے ان لوگوں کو زمینیں دیں جن کے پاس مال مویشی اور پیسہ تھا۔ کچے کی ایک ایکڑ زمین کا 100 روپے محصول مقرر کیا گیا جو 10 روپے سالانہ قسط میں ادا کرنا تھا۔ جبکہ دو بندوں کے درمیان یعنی پکے کی طرف جو زمین تھی اس پر فی ایکڑ 400 روپے محصول مقرر کیا گیا جو سالانہ 40 روپے قسط کی صورت میں بھی ادا کیا جاسکتا تھا۔ 1997 میں نواز شریف کے دور حکومت میں کچے کی زمین پر لوگوں کو دس سالہ اقساط پر مالکانہ حقوق اس شرط پر دیے گئے تھے کہ جب حکومت کو ضرورت ہوگی تو یہ زمین واپس لے لی جائے گی۔

ماسٹر صاحب کا کہنا تھا کہ کچے کی طرف زمین بہت زرخیز ہے۔ یہاں کی زمین میں سیم کم ہوتا ہے۔ گندم کا روائتی بیج جس کو سندھی تھوڑی کہتے ہیں زمین میں ڈالتے تھے تو کم محنت میں بہترین گندم حاصل ہوتی تھی۔ 1960 کے سیلاب کے بعد یہاں کی زمین کی زرخیزی میں کافی اضافہ ہوا تھا اور کاشت کی گئی فصلوں کی کسانوں کو بہت اچھی پیداوار حاصل ہوئی تھی۔ اس وقت کچے کے لوگ کافی خوشحال تصور کیے جاتے تھے۔ ان علاقوں میں اس وقت روزگار کے کافی مواقع تھے جس کی وجہ سے پکے کی طرف سے لوگ یہاں مزدوری کرنے کی غرض سے آتے تھے لیکن متواتر آنے والے سیلابوں نے خاص کر 2010 کے سیلاب نے یہاں کے رہنے والوں کی زندگیوں کو یکسر بدل دیا ہے۔ پہلے بھی بڑے سیلاب آتے تھے لیکن دریا کے کنارے جنگلات ہوتے تھے تو نقصان کم ہوتا تھا۔ استاد نے بتایا کہ ان جنگلات کی تیزی سے کٹائی نے بھی دریاؤں کے رخ اور بہاؤ پر اثر ڈالا ہے۔ اس کے علاوہ دھوئیں والی مشینری، ٹیوب ویلوں کے استعمال، درختوں کی کٹائی سے گرمی کی شدت بڑھ رہی ہے جس سے برف کے پہاڑ پگھل کر دریا کے پانی میں اضافہ کر رہے ہیں۔

نقل مکانی

ایک عورت کے مطابق 2010 میں سیلاب کی بربادی سے گاؤں ختم ہونے کے بعد دو مہینے تک گھوٹکی کے سرکاری اسکول میں رہنا پڑا جہاں بہت سے مسائل درپیش تھے۔ لوگ بہت زیادہ تعداد میں تھے اور بیت الخلاء صرف دو تھے، عورتوں کے جانے کی باری ہی نہیں آتی تھی۔ خاص کر دودھ پلانے والی مائیں بچوں کو دودھ نہیں پلاسکتی تھیں۔ یہاں پکا ہوا کھانا فوجیوں کی طرف سے دیا جاتا تھا۔ لوگ زیادہ ہونے اور گرمی کی وجہ سے بیماریاں بہت بڑھ گئیں تھیں۔ بچ جانے والا سامان اور مویشی بند پر رکھ دیئے گئے تھے اور ان کی حفاظت گاؤں کے کچھ مرد پہرہ داری کر کے کرتے تھے۔

مزید معلومات کے مطابق گاؤں کی عورتوں کا کہنا تھا کہ ہمیں اب یہ خوف رہتا ہے کہ سیلاب کم یا زیادہ لیکن آئے گا ضرور اس لیے پہلے سے ہی ٹریکٹر ٹرالیوں کے ذریعے مویشیوں اور اناج کو محفوظ کر لیتے ہیں۔ اکثر پکے کی طرف رہنے والے رشتے داروں کے گھر رکھوا دیتے ہیں۔

2010 میں حکومت بند پر سامان نہیں رکھنے دے رہی تھی کیونکہ بند پر بڑی تعداد میں مال مویشیوں کی موجودگی سے آنے جانے کا راستہ بند ہوگیا تھا اور بند پر دباؤ سے اس کے ٹوٹنے کا خطرہ پیدا ہوگیا تھا۔ پچھلے سال بھی دریا میں تین لاکھ کیوسک پانی آیا تو گاؤں کے لوگوں نے اپنی مدد آپ کے تحت اس پر مٹی کا بند باندھا لیکن پھر بھی دریا کے قریب گاؤں ڈوب گئے۔

روزگار پر اثرات

عورتوں کے ساتھ فوکس گروپ میں حاصل کردہ معلومات کے مطابق اس گاؤں کے

تمام افراد پہلے کھیتی باڑی سے وابستہ تھے۔ زمینوں کے ختم ہو جانے کے بعد اب لوگ ٹھیکے پر زمین حاصل کر کے کاشت کرتے ہیں جبکہ کچھ لوگ مٹی کی بھرائی اور کچھ روزگار نہ ملنے کی وجہ سے سعودی عرب میں روزی کمانے کے لیے چلے گئے ہیں۔ سیلاب سے پہلے گاؤں کی زیادہ تر مزدور کسان عورتیں اپنے گھرانے کی زمینوں پر کام کرتی تھیں جو اب دوسروں کی زمینوں پر مزدوری کرتی ہیں۔

حبیب اللہ چاچڑ کے مکین جب شیک بند کے قریب آکر آباد ہوئے تو یہ علاقہ بھی 2010 کے سیلاب سے بری طرح متاثر ہوا تھا۔ اس علاقے میں پہلے گندم، چاول، گنا اور کپاس کاشت کی جاتی تھی۔ کسان مزدور عورتیں کپاس کی چنائی بھی کرتی تھیں۔ سیلاب میں ان فصلوں کے تباہ ہونے کے بعد اب یہاں صرف گنا اور چاول کاشت کیا جاتا ہے، کپاس کاشت نہیں کی جاتی کیونکہ پانی آجانے سے یہ فصل تباہ ہو جاتی ہے جبکہ گنے اور چاول کی فصل میں دریا کا تھوڑا پانی آبھی جائے تو ان فصلوں کے بچنے کا امکان رہتا ہے۔ 2010 کے سیلاب کے بعد دریا کا پانی کافی دیر میں اترا تھا۔ جب یہ گاؤں دوسری جگہ آکر آباد ہوا تو اس وقت ٹھیکہ پر زمین لے کر ٹماٹر، توری اور تربوز کاشت کر دیے گئے تھے۔ کیونکہ تھوڑا سیلابی پانی کھڑا تھا۔ اس پانی میں یہ سبزیاں کاشت کی جاسکتی تھی جس کا مقصد یہ تھا کہ ان فصلوں سے حاصل ہونے والی رقم سے غلہ خرید سکیں۔ خاص کر سبزیوں کی کاشت کے لیے زمین دریا کے قریب ٹھیکہ پر لی جاتی ہے۔ پانی کھینچنے کی مشین ''پیٹر'' کے ذریعے دریا کا پانی فصل کو لگایا جاتا ہے۔ بہت سے کسان ایسے بھی تھے جنھوں نے بچ جانے والے مال مویشیوں کو فروخت کر کے ٹھیکے کی رقم ادا کی۔ ان علاقوں میں مارچ کے مہینے سے ہی دریا کا پانی چڑھنا شروع ہو جاتا ہے۔ ابھی بھی ڈر ہے کہ اگر پانی زیادہ آیا تو گنے کی فصل خراب ہوجائے گی۔

مال مویشیوں پر اثرات

گاؤں کی عورتوں کا کہنا تھا کہ ''ہم جانتے تو تھے کہ سیلاب آتے ہیں، پریشانیاں اٹھانی پڑتی ہیں لیکن اس کا اندازہ نہیں تھا کہ سیلاب ایک رات میں یہ سب کچھ ختم کر سکتا ہے''۔ ایک عورت نے تفصیلاً بتایا کہ ''سیلاب کے دنوں میں ہم اپنی گھروں کی چھتوں پر سامان رکھ دیا کرتے تھے پر اس سال صرف دریا کا پانی ہی نہیں تھا بلکہ اوپر سے بارش کا پانی سب بہا لے گیا۔ یہاں تک کہ گھر کی چارپائیاں اور غلہ تک بہہ گیا۔ زیادہ تر بندھے ہوئے مویشی پانی میں ڈوب گئے انہیں کھولنے کا وقت ہی نہیں مل سکا۔ کافی بڑی تعداد میں مویشی مر گئے اور جو بچ گئے انہیں فروخت کر کے اپنا گزر بسر کیا کیونکہ مویشیوں کے چارے کا بہت مسئلہ تھا جو کچھ تھا وہ سیلاب کی نظر ہوچکا تھا۔ اس سے پہلے مال مویشیوں کو رکھنا مسئلہ نہیں تھا لیکن جب سے زمین گئی ہے مال مویشیوں کو سنبھالنا مشکل ہوتا جارہا ہے''۔

ایک عورت کا کہنا تھا کہ ''ہماری زندگی اور ذریعہ معاش انہی علاقوں سے جڑا ہوا ہے۔ اگر یہاں سے جانے کا سوچا بھی جائے تو کچے کی زمین اب کوئی خریدنے کو تیار نہیں ہوتا اور پکے کی طرف زمین کی قیمتیں بہت زیادہ ہیں۔ ہم تو پہلے ہی اپنا سب کھو چکے ہیں اب اتنے وسائل نہیں کہ اس بارے میں سوچا جاسکے''۔ ایک عورت نے بتایا کہ دھوئیں کی وجہ سے گرمائش پھیل رہی ہے۔ بارشوں اور سیلابوں کی وجہ سے سردی بھی بڑھ رہی ہے۔ عورتوں کو معلوم تھا کہ جب تک وہ کچے کے علاقوں کی طرف رہیں گی سیلاب ان کی زندگی کا حصہ رہے گا۔

خلاصہ

مذکورہ حاصل کردہ معلومات سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ بدلتے موسمی حالات اور ان کے سبب آنے والے سیلاب ایک مسلسل آفت کا روپ دھار چکے ہیں جس کی وجہ سے کچے کے علاقوں میں قائم یہ بستیاں ہر سال سیلاب میں اپنا سب کچھ گنواں دیتی ہیں۔ مسلسل آنے والے سیلاب کے خوف اور اس کے ساتھ آنے والی تباہی اور بربادی سے بستیاں غیر یقینی صورتحال کا شکار ہیں۔

دریائی علاقے جو مال مویشی رکھنے کے حوالے سے اہم سمجھے جاتے تھے اب وہاں سیلاب کے باعث مال مویشیوں کی دیکھ بھال اور ان کے چارے کا انتظام سنگین صورتحال اختیار کرتا جارہا ہے۔ متواتر سیلابوں میں نہ صرف ان آبادیوں نے مال مویشیوں کی جانیں گنوائی بلکہ ان کو حصے پر مویشی پالنے پر مجبور کردیا۔

بدلتے موسمی اثرات سے براہ راست متاثر ہونے کے باوجود اکثر آبادیوں میں خصوصاً عورتیں دوہرے طریقے سے پسنے کے باوجود بھی موسمی تبدیلی لانے والے عوامل سے بے خبر نظر آتی ہیں۔

جیسا کہ ابتداء میں اس بات کو واضح کیا گیا تھا کہ گرین ہاؤس گیسز کے اخراج سے دنیا کا درجہ حرارت بڑھ رہا ہے۔ پہلی دنیا کے سرمایہ دار ممالک صنعتوں کے پیداواری عمل کے لیے بڑے پیمانے پر ایندھن کا استعمال کرتے ہیں جس سے ان گیسز کا اخراج ہوتا ہے۔ اس عالمی مسئلے پر قابو پانے کے حوالے سے پہلی دفعہ 1979 میں کلائمٹ کانفرنس منعقد کی گئی جس میں موسمی تبدیلی کو ایک اہم مسئلے کے طور پر اٹھایا گیا اور حکومتوں پر زور دیا گیا کہ انسانی مداخلت کے سبب آب و ہوا میں سنگین تبدیلیوں کے لیے اقدامات کریں۔ اس کے بعد عالمی حدت کو دیکھتے ہوئے کئی معاہدے ہوئے خصوصاً ویانا کنونشن اور کیوٹو پروٹوکول جس کو ارتھ سمٹ کا نام دیا جاتا ہے، پیش کیے گئے۔ ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ممالک پر زور دیا گیا کہ وہ اپنے ممالک میں ایک مخصوص سطح تک ان گیسز کے اخراج میں کمی لائیں۔ 137 ترقی پذیر ممالک نے اس معاہدے کی منظوری دی جبکہ گرین ہاؤس گیسز کے سب سے زیادہ اخراج کے ذمہ دار امریکہ نے اس معاہدے کے نفاذ کے لیے پیش کردہ میکنزم پر تحفظات کا اظہار

کرتے ہوئے اس کی توثیق نہیں کی۔ ایسے میں وہ ممالک جو فضا میں یہ گیسز پھیلانے کے ذمہ دار نہیں ہے ان سے توقع کرنا غیر منصفانہ عمل ہے۔[20] حقیقت میں پہلی دنیا کے ممالک اپنی صنعتی سرگرمیاں محدود کرنے کو تیار نہیں۔ اگر وہ کوئلے، گیس اور تیل کا استعمال ختم کرتے ہیں تو ان کی صنعتی پیداوار متاثر ہوگی اور ان کے منافع کو بھاری دھچکہ پڑے گا۔

ہمیں ایک طرف تو ان سرمایہ دار ممالک کی سازشوں کا سامنا ہے اور دوسری طرف ملک میں جاگیردارانہ نظام کی کئی شکلیں بری طرح حاوی ہیں۔ کچے کے زیادہ تر کسانوں کی زمینیں یا تو دریائی پانی کی نظر ہوچکی ہیں یا پھر سیلاب کے ساتھ آنے والی ریت نے ان کی زمینوں کو قابل کاشت نہیں چھوڑا ہے۔ اسی لیے زیادہ تر کسان یا تو بے زمین ہیں یا پھر ٹھیکہ کی زمین پر کام کرنے پر مجبور ہیں۔ ان میں سے اکثر و بیشتر کسان اپنے مال مویشی فروخت کرکے ٹھیکہ کی رقم ادا کرتے ہیں تاکہ اپنے خاندان کے لیے خوراک محفوظ کرسکیں۔ غیر متوقع دریائی پانی بڑھ جانے، سیلاب سے کسانوں کی فصلوں کی تباہی اور قرضوں کے بوجھ کا ذمہ دار اس حکمران اور ان کے ساتھ شامل جاگیردار طبقے کو ٹھہرایا جائے جو اس ملک کے اہم پیداواری وسائل پر نہ صرف قابض ہیں بلکہ انہی کسان مزدور بستیوں کی محنت سے منافع بنا رہے ہیں۔

دنیا بھر میں اس وقت 20 سے زیادہ بین الاقوامی، علاقائی سول سوسائٹی کی تنظیمیں، نیٹ ورکس اور تقریباً 130 ممالک عالمی سطح پر ''موسمیاتی انصاف کے مطالبے'' کی مہم چلا رہے ہیں۔ اس مہم کا مقصد طاقت ور حکومتوں، بین الاقوامی اداروں اور عالمی سطح پر قائم کارپوریشن جو دنیا کو مزید تباہی کی طرف لے جا رہی ہیں کہ عالمی سطح پر کیے جانے والے اقدامات کے خلاف کھڑے ہونا اور عوام کو تباہ کن موسمی تبدیلی کے حالیہ اور ممکنہ مستقبل کے اثرات سے نمٹنے کے لیے اہل بنانا ہے۔

عالمی سطح پر اس مہم کی بنیاد پر عالمی برادری سے چند اہم مطالبے کیے گئے۔

- تباہ کن موسمی تبدیلی کو روکنے اور گیسز کے اخراج میں کمی کے لیے منصفانہ اشتراک کو یقینی بنایا جائے۔
- موسمی بحران سے نمٹنے کے لیے پیش کردہ غیر حقیقی حل کی روک تھام کی جائے۔
- موسمی بحران کے ذمہ دار ممالک پر قانون کے مطابق جرمانے عائد کیے جائیں اور اس رقم کو متاثرہ لوگوں کی بحالی کے لیے استعمال کیا جائے۔
- ترقی یافتہ ممالک کا محفوظ اور ماحول سے مطابقت رکھنے والی ٹیکنالوجی کے مفت تبادلے کو یقینی بنائیں۔
- برابری کی بنیاد پر پائیدار ترقی، عوام کے حقوق اور کرہ ارض کے احترام پر مبنی نظام جیسی بنیادی تبدیلی کی جانب قدم بڑھایا جائے۔[21]

عالمی سطح پر تو ہمیں مختلف تنظیموں کی جدوجہد نظر آتی ہے۔ اگر پاکستان کے حوالے سے بات کی جائے تو ہمارے حکومتی اداروں اور حکام بالا کے دعوے صرف نام نہاد امدادی کاموں اور ہر سال ان موسمی آفات کے بعد بڑے بڑے منصوبوں کے دعووں تک محدود ہو جاتے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ دنیا میں جاری دیگر تحریکوں کی طرح پاکستان میں بھی سرمایہ داری اور جاگیرداری جیسے عوام مخالف نظاموں کے خلاف تحریکیں کھڑی ہوں تاکہ اس ملک میں زرعی زمینوں کی مساویانہ اور منصفانہ تقسیم عمل میں لائی جائے اور ان بستیوں کو بھی زمینیں، روزگار اور رہائش کی سہولیات فراہم کی جائیں جو ان پیداواری وسائل کے اصل حقدار ہیں تاکہ ان کی زندگیوں کو قدرتی آفات سے بچایا جاسکے۔

حوالہ جات

1. Sardar, Shahzad, Muhammad et al. "Poverty in riverine areas: vulnerabilities, social gaps and flood damages." Pakistan Journal of Life and Social Sicience 6 (1): 25-31, 2008. Accessed from http://www.pjlss.edu.pk/pdf_files/2008_1/25-31.pdf
2. Panhwar, Ali, Nasir. "Rivers in crisis." The Express Tribune, March 14, 2015. Accessed from http://tribune.com.pk/story/852775/rivers-in-crisis/
3. Ghazanfar, Munir. "The enviromental case of Sindh." Lahore Journal of Policy Studies 3 (1): December, 2009. Accessed from http://www.indiaenvironmentportal.org.in/files/Sindh.pdf
4. Ibid.
5. Abbass, Zehar. "Climate change, poverty and environmental crisis in the disaster prone areas of Pakistan." Oxfam GB, November, 2009. p. 11. Accessed from http://www.preventionweb.net/files/11815 _ogbreportclimatechangepakistan1.pdf
6. Ibid. p. 13.
7. Bangash, Bashir, Fahad. "Tackling risks of glacial lake outburst floods in Pakistan's north." Pamir Times, 22 January, 2015. Accessed from http://pamirtimes.net/2015/01/22/tackling-risks-of-glacial-lake-outburst-floods-in-pakistans-north/
8. Khan, Ahmad, Nisar. "Rivers in Pakistan." Pakistan Geographic. Accessed from http://pakistangeographic.com/rivers.html
9. Ahmad Hussain et al. "Flash flood risk assessment in Pakistan." Pakistan Engineering Congress, Paper no 707. p. 701. Accessed from http://pecongress.org.pk/images/upload/books/FLASHFLOOD%20RISK %2020ASSESSMENT%20IN%20PAKISTAN%20(28).pdf
10. Larsen, O, Oliver, J. and Casiles Lanuza, E. "Developing a disaster risk insurance framework for vulnerable communities in Pakistan: Pakistan disaster risk profile." Report No. 16 May, 2014. United Nations University Institute for Environment and Human Security. p. 14. Accessed from http://collections.unu.edu/eserv/UNU:1854/pdf11810.pdf

(بقیہ حوالہ جات صفحہ نمبر 52 پر دیکھیں)

بجٹ 2015-16 : ایک جائزہ

تحریر: ولی حیدر

اس مضمون میں بجٹ 2015-16 کا جائزہ لیا گیا ہے چونکہ بجٹ کے تمام پہلوؤں کا جائزہ ایک مضمون میں ممکن نہیں اس لیے راقم کے خیال کے مطابق بجٹ کے اہم نکات پر روشنی ڈالی جارہی ہے۔ وفاقی وزیرِخزانہ، مالیات، اقتصادی امور سینٹر اسحاق ڈار نے 5 جون، 2015 کو قومی اسمبلی میں بجٹ 2015-16 پیش کیا۔

گزشتہ مالی سال 2014-15 کی بجٹ تقریر میں اسحاق ڈار نے کہا تھا کہ:

''میں انتہائی عاجزی سے یہ کہنا چاہوں گا کہ مشکل فیصلوں کی بدولت آج اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے نہ صرف ملکی معیشت بحال ہوچکی ہے بلکہ استحکام اور ترقی کے راستے پر گامزن ہے''۔[1]

یہ مشکل فیصلے جو کہ آئی ایم ایف کے دباؤ میں کیے گئے تھے جن میں

''31 حکومتی اداروں کی نجکاری، بجلی کے بلوں پر مراعات کا خاتمہ، اسٹیٹ بینک کو ایک آزاد اور خود مختار ادارہ بنانے کے لیے آئین میں تبدیلی تاکہ اسٹیٹ بینک اپنی مالیاتی پالیسی آزادانہ طور پر بنا سکے وغیرہ شامل ہیں''۔[2]

اس کے برعکس حالیہ بجٹ تقریر 2015-16 کے دوران انہوں نے کہا کہ:

''چونکہ عالمی مالیاتی ادارے پاکستان کے ساتھ کام کرنے سے انکار کرچکے تھے اس لیے عالمی وسائل کی آمد تو مکمل طور پر بند ہوگئی تھی اور ذخائر کا خاتمہ صاف نظر آرہا تھا۔ تاہم ہم نے تہیہ کر رکھا تھا کہ ان معاشی پنڈتوں کو واضح طور پر غلط ثابت کریں گے اور قوم نے دیکھا کہ پاکستانی معیشت کی ڈوبتی کشتی اب محفوظ کناروں تک پہنچ چکی ہے''۔[3]

ان دونوں بیانات کا بغور جائزہ لیا جائے تو تضاد صاف نظر آتا ہے۔ اگر پچھلے مالی سال میں معیشت استحکام اور ترقی کے راہ پر گامزن ہوچکی تھی تو اس سال اسے کیوں ڈوبتی کشتی سے تشبیہ دی جارہی ہے؟ اگر معاشی پنڈتوں کا بھروسہ نہیں تو اس قدر گھمبیر عوام دشمن پالیسی میں تبدیلی کیوں کی جارہی ہے؟

پچھلے مالی سال کی مجموعی معاشی صورتحال کا جائزہ لیتے ہوئے کہا کہ فی کس سالانہ آمدنی جو کہ 1384 ڈالرز سالانہ تھی، 9.3 فیصد کے اضافے کے ساتھ 1512 ڈالرز سالانہ ہوگئی ہے۔ افراط زر کی شرح پچھلے پانچ سالوں میں 12 فیصد رہی جو اب کم ہوکر 4.6 فیصد پر آگئی ہے اور یہ پچھلے 15 سالوں کی کم ترین شرح ہے۔ ٹیکس کی وصولی جو مالی سال 2012-13 میں تین فیصد تھی اس میں 2013-14 میں 16.4 فیصد اضافہ ہوا ہے۔ مالیاتی خسارہ جو پچھلے سال 8.8 فیصد تھا کم ہوکر 8.2 فیصد ہوگیا ہے جسے 2015-16 میں پانچ فیصد تک لانے کا ہدف ہے۔ گزشتہ مالی سال کے پہلے 10 ماہ میں برآمدات 20.83 بلین ڈالرز تھی جو 3.2 فیصد کم ہوکر 20.18 بلین ڈالرز رہ گئی ہے۔ اس کے مقابلے میں درآمدات جو 2013-14 میں 34.65 بلین ڈالرز تھی کم ہو کر 34.09 ڈالرز ریکارڈ کی گئی جو کہ تقریباً 1.61 فیصد کی کمی ہے۔ بیرون ملک مقیم پاکستانیوں کی بھیجی جانے والی رقم (foreign remittances) جو 2013-14 کے پہلے 10 ماہ میں 12.89 بلین ڈالرز تھیں، 2014-15 کے اسی عرصہ میں 16.14 فیصد اضافے سے 14.97 بلین ڈالرز ہوگئی ہے۔[4]

آیئے اب ہم بجٹ 2015-16 کا جائزہ لیتے ہیں۔

بجٹ حکمت عملی کے سات بنیادی عناصر مندرجہ ذیل ہیں:[5]

1۔ مالیاتی خسارے کو بتدریج کم کرنا؛
2۔ ٹیکس/محصولات میں اضافہ؛
3۔ توانائی پر مسلسل توجہ؛
4۔ برآمدات میں اضافہ؛
5۔ جی ڈی پی کے حساب سے سرمایہ کاری کی شرح میں اضافہ (investment to GDP ratio)؛
6۔ سرکاری قرضوں میں کمی؛
7۔ بے نظیر انکم سپورٹ پروگرام۔

مالیاتی خسارہ کم کرنے سے مراد حکومتی آمدنی اور اخراجات کے درمیان فرق کو کم کرنا ہے۔ مثال کے طور پر رواں مالی سال کے پیش کردہ بجٹ کے تحت پاکستان کا سالانہ خرچہ 4451.3 بلین روپے جبکہ آمدنی کا تخمینہ 4168.3 بلین روپے لگایا گیا ہے۔ اس طرح رواں مالی سال کا مالیاتی خسارہ 283 بلین روپے ہوا۔

جی ڈی پی کی شرح کے مقابلہ میں سرمایہ کاری میں اضافے کو بجٹ حکمت عملی کے حوالے سے اہم قرار دیا گیا ہے۔ جی ڈی پی کی شرح کے مقابلے میں سرمایہ کاری ایک ایسا معاشی اشارہ ہے جو کہ ملک میں پیداوار اور خدمات سے حاصل کردہ کل مالیت (یعنی جی ڈی پی) میں سرمایہ کاری کی مالیت سے ناپا جاتا ہے۔ یعنی ملک کے جی ڈی پی میں سرمایہ کار جو پیسہ، آلہ جات و عمارتیں اور دیگر اشیاء پر خرچ کرتے ہیں اس کو کیپٹل اسٹاک کہا جاتا ہے۔ اگر جی ڈی پی میں کیپٹل اسٹاک کی شرح زیادہ ہو تو اس کو قابل ستائش سمجھا جاتا ہے کیونکہ سرمایہ کار کے ملک میں پیسہ لگانے سے یہ اخذ کیا جاتا ہے کہ وہ مزید سرمایہ کاری کرنے کا خواہش مند ہے۔

توانائی پر مسلسل توجہ سے مراد 2015 میں آئی ایم ایف سے کیے گئے

معاہدے میں توانائی پر توجہ کو توانائی کے شعبے میں اصلاحات (Energy Sector Reform) سے تشبیہہ دی گئی ہے جس کے تحت ایک مقررہ مدت میں موثر حکمت عملی کے ذریعے بجلی کے نرخوں میں بگاڑ، بلوں کی ناکافی وصولی، مہنگی اور غیر تسلی بخش اہداف کے لیے زرتلافی کی فراہمی، انتظامی ونگرانی میں خرابیاں اور عالمی شراکت داروں کی مدد سے بجلی کی ترسیل اور تقسیم کی ناقص صورتحال کو بہتر بنانا شامل ہیں۔6 اس کے علاوہ نجی شعبے کو بجلی کی ترسیل کے منصوبوں کی طرف مائل کرنے کے لیے ٹرانسمیشن لائن منصوبوں سے حاصل ہونے والی آمدنی پر 10 سال کے لیے انکم ٹیکس سے چھوٹ دی جائے گی بشرطیکہ منصوبہ جون 2018 تک شروع کردیا جائے۔7 یہ تمام اصلاحات توانائی کے شعبے میں حکومت کی جاری ترجیحات کی نشاندہی کرتی ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ توانائی پر توجہ سے مراد نجی شعبے کا فروغ ہے جس کے نتیجے میں پہلے ہی کراچی میں بجلی کی فراہمی کی ذمہ داری کے الیکٹرک (K Electric) نجی کمپنی کو دے دی گئی ہے۔ اسی طرح ملک کے دیگر شہروں اسلام آباد، لاہور اور فیصل آباد کے بجلی کا نظام بھی نجی کمپنیوں کو دینے کا منصوبہ زیر غور ہے۔8

سرکاری قرضے سے مراد حکومت کا اندرونی اور بیرونی ذرائع سے حاصل کردہ مجموعی قرضے سے لیا جاتا ہے۔ مجموعی قرضے میں آئی ایم ایف سے لیے گئے قرضوں کو بھی شامل کیا جاتا ہے۔9

اوپر بیان کی گئی تقریباً تمام حکمت عملیاں یقیناً عوامی خواہشات سے ہم آہنگ نہیں۔ جس ملک کی آدھی سے زیادہ آبادی زندگی کی بنیادی سہولیات سے دور ہو اس ملک کی اقتصادی ترجیحات روزگار میں اضافہ، پیداواری صلاحیت میں اضافہ، عوام تک بنیادی سہولیات کی فراہمی اور غربت میں کمی وغیرہ ہونی چاہیے۔

بیان کیے گئے بنیادی عناصر میں صرف بے نظیر انکم سپورٹ پروگرام واحد شعبہ ہے جس میں عوامی فلاح کا پہلو دیکھا جاسکتا ہے۔ گو کہ اس کے حقیقی اثرات پر بھی تنقیدی تجزیے کی ضرورت ہے۔ اس کے علاوہ دیگر چھ بنیادی عناصر میں سرمایہ دارانہ نظریے کے تحت عوامی فلاح کو یکسر نظرانداز کرتے ہوئے ایسی حکمت عملیاں ترتیب دی گئی ہیں جن سے غریب آبادیوں خصوصاً مزدور طبقے پر انتہائی منفی اثرات مرتب ہوں گے جس میں بجلی کی بلوں میں بے پناہ اضافہ سرفہرست ہے۔ گزشتہ چند سالوں سے بجلی کے بلوں میں مسلسل اضافہ دیکھنے میں آرہا ہے۔ جس کا مستقبل میں مزید اضافہ یقینی ہے۔ غور طلب پہلو یہ ہے کہ طویل لوڈ شیڈنگ کے باوجود بجلی کے بلوں میں اضافے کا کوئی جواز نظر نہیں آتا۔ تازہ ترین اطلاعات کے مطابق بجلی کے نرخوں میں مزید 30 فیصد اضافہ کردیا گیا ہے جس کا اطلاق 4 جولائی سے ہوگا۔10

وقت کے ساتھ ساتھ موجودہ حکومت کے اصل عزائم کھل کر سامنے آرہے ہیں۔ مثال کے طور پر پچھلے سال بجٹ تقریر میں وزیر خزانہ نے جو ترقیاتی تصور یا وژن دیا تھا اس میں اقتصادی خود مختاری، حکومتی اخراجات میں کفایت شعاری، آبادی کے کمزور اور غریب طبقات کو افراط زر سے بچاؤ جیسے کچھ عوام دوست پہلو نظر آتے تھے مگر موجودہ بجٹ میں تو ان مثبت پہلوؤں کا جن سے مزدور بے روزگار آبادیوں کا گہرا تعلق ہے دور دور تک اشارہ تک نہیں۔

وزیر خزانہ نے بجٹ تقریر کے دوران کہا کہ ہمیشہ کی طرح اس دفعہ بھی بجٹ حکمت عملی وسط مدتی تناظر (Midterm Framework) میں بنایا گیا ہے۔ وسط مدتی تناظر سے مراد ہر سال بجٹ کی ترجیحات طے کرنے کے برعکس ایک ایسے وسط مدتی (تین یا پانچ سالہ) بجٹ بنانے کے لائحہ عمل سے ہے جو حکومت کے خرچوں کو حکومتی پالیسیوں سے ہم آہنگ بنانے کا ضابطہ فراہم کرتی ہے۔11 یاد رہے کہ وسط مدتی بجٹ کا خیال آئی ایم ایف نے دیا تھا جس کا مقصد قرضہ حاصل کرنے والے ممالک کی شفافیت اور نگرانی کو مزید مضبوط اور فعال بنانا تھا۔ یہ وسط مدتی بجٹ حکمت عملی 18-2015 تک کا احاطہ کرتی ہے جس کے چیدہ چیدہ نکات مندرجہ ذیل ہیں12:

1۔ جی ڈی پی گروتھ یا جی ڈی پی میں بڑھوتری کو 18-2017 تک سات فیصد تک لے جایا جارہا ہے۔

2۔ تین سالہ درمیانی مدت میں افراط زر کو ایک عددی (single digit) حد میں رکھا جائے گا۔

3۔ سرمایہ کاری کی شرح کو جی ڈی پی کے مقابلے میں دو فیصد تک لایا جائے گا۔

4۔ بجٹ خسارہ (fiscal deficit) 3.5 فیصد تک لایا جائے گا۔

5۔ ٹیکس وصولی کی شرح کو جی ڈی پی کی 13 فیصد تک بڑھایا جائے گا۔

6۔ زرمبادلہ کے ذخائر کو 20 بلین ڈالرز سے زیادہ کیا جائے گا۔

جی ڈی پی سے مراد مجموعی قومی پیداوار سے ہے۔ مجموعی قومی پیداوار سے مراد ایک مالی سال کے دوران ملک کی مجموعی معاشی پیداوار (اشیاء اور خدمات) سے حاصل کردہ آمدنی ہے۔

افراط زر سے مراد مہنگائی ہے جو کہ حکومتی دعوؤں کے مطابق 2015 میں کم ہو کر 3.2 فیصد پر آ گئی ہے اور اسے ایک عددی حد پر رکھنے کا ہی فیصلہ کیا گیا ہے۔ حکومت مہنگائی میں کمی کا دعویٰ تو کرتی ہے مگر حقیقتاً بڑے پیمانے پر بے روزگاری کی وجہ سے ان اعداد و شمار کا عوام پر کوئی اثر نظر نہیں آتا اور عوام زندہ رہنے کی بنیادی ضرورتوں خصوصاً تعلیم، صحت، خوراک، اور روزگار تک رسائی سے محروم ہیں۔ اس کے علاوہ ملک کی بہت بڑی آبادی بھوک اور غذائی کمی کا بھی شکار ہے۔

جی ڈی پی کے مقابلے ٹیکس وصولی کی شرح 13.9 فیصد ہے جبکہ حکومت کی خواہش ہے کہ اسے بڑھا کر 22 فیصد تک لایا جائے۔ جی ڈی پی کے مقابلہ ٹیکس کی شرح معلوم کرنے کے لیے حکومت کی طرف سے کل جمع کردہ محصولات کو ملک کے اندر اشیاء و خدمات کی کل پیداواری قیمت سے تقسیم کیا جاتا ہے۔ یعنی اگر ٹیکس بمقابلہ جی ڈی پی کی شرح بڑھانے کا فیصلہ ہے تو اس کا مطلب ٹیکس سے حاصل کردہ آمدنی کو بڑھانا لازمی ہے۔ یہاں یہ امر باعث تشویش ہے کہ حکومت بجائے اس کے کہ

طبقہ اشرافیہ پر براہ راست ٹیکس عائد کرے، بلاواسطہ ٹیکسوں کے نفاذ کے ذریعے عوام پر بھاری بوجھ ڈال رہی ہے۔ دوسری طرف بڑی بڑی کمپنیوں اور کاروباری شعبہ کو کئی طرح کے ٹیکسوں سے چھوٹ دی جارہی ہے۔

وزیرخزانہ کا پیش کردہ بجٹ مجموعی طور پر 4,451.3 بلین روپے کا ہے۔ جبکہ آمدنی کا تخمینہ تقریباً 4,168.3 بلین روپے ہے۔ یہاں یہ بتانا انتہائی ضروری ہے کہ مجموعی آمدنی کا زیادہ تر حصہ ٹیکسوں سے حاصل کیا جائے گا۔ براہ راست ٹیکسوں کی وصولی سے 1,347,872 ملین روپے جب کہ بلاواسطہ ٹیکسوں کی وصولی سے 1,755,834 ملین روپے آمدنی کا تخمینہ لگایا گیا ہے جو مجموعی آمدنی کا تقریباً 60 فیصد ہے۔ ایک طرف وزیرخزانہ عوامی بہبود کی بات کرتے ہیں اور دوسری طرف بلاواسطہ ٹیکسوں کے ذریعے عوام پر مہنگائی کا بم گرانے کا اہتمام کررہے ہیں۔ مگر کیا کیجیے کہ ہمارے حکمرانوں کو عوام سے زیادہ مٹھی بھر اشرافیہ کی خوشنودی عزیز ہے۔ قومی مالیاتی کمیشن (این ایف سی ایوارڈ) کے تحت مالی سال 2015-16 میں صوبوں کے لیے مختص رقم میں غیر استعمال شدہ رقم کو بھی آمدنی کے زمرے میں دکھایا گیا ہے جو مجموعی آمدنی کا سات فیصد ہے۔ اس کے علاوہ بیرونی قرضوں اور سرمایہ کاری سے تقریباً 33 فیصد رقم حاصل کی جارہی ہے۔

جدول 1: آمدنی کا تخمینہ

شعبہ	رقم (ملین روپے)	فیصد
ٹیکس	2,463,351	59.5
بیرونی ذریعے	751,511	18
صوبوں کی بچی ہوئی رقم	297,173	7
سرمایہ کاری	606,303	14.5
نجکاری*	50,000	1

بحوالہ: سینیٹر محمد اسحاق ڈار وفاقی وزیر برائے خزانہ، مالیات، 2015-16، صفحہ 9۔

* نجکاری سے حاصل ہونے والی آمدنی سے مراد سرکاری اداروں کی فروخت سے حاصل کردہ رقم سے ہے۔

بجٹ 2015-16 کے مجموعی اخراجات کا تخمینہ 4,451.3 بلین روپے لگایا گیا ہے۔ عوام کے لیے انتہائی اہم شعبہ ترقیاتی اخراجات کا ہے۔ اعداد شمار کے مطابق مجموعی ترقیاتی اخراجات کے لیے 9,69,039 ملین روپے رکھے گئے ہیں جو پچھلے سال کے مقابلے میں تقریباً 28 فیصد زیادہ ہے۔ اسی طرح وفاقی ترقیاتی اخراجات کے لیے 700,000 ملین روپے مختص کیے گئے ہیں جو پچھلے سال کے مقابلے میں تقریباً 29 فیصد زیادہ ہے۔ جبکہ دیگر ترقیاتی منصوبوں کے لیے 164,466 ملین روپے رکھے گئے ہیں جو پچھلے سال کے مقابلے تقریباً 24 فیصد زیادہ ہے۔ مجموعی اخراجات کو دومختلف حصوں میں دکھایا گیا ہے (جدول 2)۔

جدول 2: مجموعی اخراجات کا تخمینہ

شعبہ	رقم (ملین روپے)	فیصد
جاری اخراجات	3,482,239	78
مجموعی ترقیاتی اخراجات	969,039	22

بحوالہ: سینیٹر محمد اسحاق ڈار وفاقی وزیر برائے خزانہ، مالیات، 2015-16، صفحہ 8۔

اعداد وشمار سے واضح ہے کہ جاری اخراجات کی مد میں مجموعی اخراجات کا 78 فیصد مختص کیا گیا ہے۔ جاری اخراجات کی تفصیل کو جدول 3 میں دکھایا گیا ہے۔

جدول 3: جاری اخراجات

شعبہ	رقم (ملین روپے)	فیصد
عمومی عوامی خدمات	2,446,604	70.2
دفاعی شعبہ اور خدمات	781,162	22.4
امن و عامہ اور حفاظتی شعبہ	94,899	2.7
معاشی شعبہ	60,195	1.7
ماحولیاتی تحفظ	1,055	0.03
رہائشی اور علاقائی خدمات	2,256	0.06
صحت اور خدمات	11,010	0.32
مذہب، ثقافت اور تفریح	7,637	0.22
تعلیم اور خدمات	75,580	2.17
سماجی تحفظ	1,840	0.05

بحوالہ: سینیٹر محمد اسحاق ڈار وفاقی وزیر برائے خزانہ، مالیات، 2015-16، صفحہ 23۔

کل جاری اخراجات کا 70.3 فیصد صرف عمومی عوامی خدمات کے لیے مختص کیا گیا ہے۔ جبکہ دفاعی شعبہ کے لیے 22.4 فیصد مختص کیا گیا ہے۔ عمومی عوامی خدمات کی تفصیل نیچے دی جارہی ہے (جدول 4)۔

جدول 4: عمومی عوامی خدمات

شعبہ	رقم (ملین روپے)	فیصد
سالانہ الاؤنس اور پنشن	231,000	7
بیرونی قرضوں کی سہولیات/خدمات	111,219	4
بیرونی قرضوں کی واپسی	316,373	9
اندرونی قرضوں کی واپسی/سہولیات	1,168,676	33.57
دیگر	176,635	5.08

بیرونی معاشی امداد	100	0.01
صوبوں کو منتقلی	409,875	11.77
عمومی خدمات	6,415	0.19
بنیادی تحقیق	3,559	0.11
عمومی عوام کی ترقی کے لیے تحقیق	10,683	0.31
عمومی عوامی خدمات کے لیے انتظامی اخراجات	2,150	0.07
عمومی عوامی خدمات جو کہیں اور نہیں	9,920	0.29

بحوالہ: سینیٹر محمد اسحاق ڈار وفاقی وزیر برائے خزانہ، مالیات، 16-2015، صفحہ 24۔

یہاں گہرائی سے سمجھنے کی بات یہ ہے کہ عمومی عوامی خدمات جس کی مد میں تقریباً 70 فیصد بجٹ مختص کیا گیا ہے میں کون کون سے شعبے شامل ہیں۔ صرف قرضوں کی ادائیگی کے لیے تقریباً 45 فیصد رقم مختص کی گئی ہے جس میں سے 33.57 فیصد اندرونی قرضوں کے لیے ہے۔ ایک عام آدمی سمجھنے سے قاصر ہے کہ عمومی عوامی خدمات کے اندر قرضوں کی واپسی کی رقم کیوں رکھی گئی؟ سالانہ الاؤنس اور پنشن کی مد میں جو رقم مختص کی گئی ہے اس میں سے تقریباً 76 فیصد صرف ریٹائرڈ فوجیوں کو پنشن دینے کے لیے رکھی گئی ہے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ فوج کے علاوہ دیگر سرکاری ملازمین کی تعداد کہیں زیادہ ہے مگر ان کے لیے انتہائی قلیل رقم مختص کرنا ایک قابل فکر پہلو ہے۔ حقیقی عمومی عوامی خدمات تو عوام کو سہولیات فراہم کرنے میں استعمال کی جانی چاہیے مگر جب بجٹ کا ایک بڑا حصہ عمومی عوامی خدمات کے بجائے دیگر شعبوں میں خرچ کیا جائے تو عوام کی بہتری ممکن نہیں کہ جس کی زمینی حقائق گواہی بھی دیتے ہیں (جدول 3)۔

جاری اخراجات میں دوسرا اہم شعبہ دفاعی اخراجات ہیں جس پر 22.4 فیصد مختص کیا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جاری اخراجات کے مجموعی بجٹ کا تقریباً 92 فیصد صرف دو شعبوں یعنی مجموعی عوامی خدمات اور دفاعی اخراجات پر خرچ ہوگا۔ یہاں یہ نقطہ غور طلب ہے کہ عمومی عوامی خدمات میں بھی فوج کے لیے رقم مختص کی گئی ہے جبکہ دفاعی بجٹ میں بھی ملازمین سے متعلق اخراجات کا تخمینہ ظاہر کیا گیا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ریاست ملک کے تمام طبقوں کو یکساں اہمیت دے اور دیگر شعبوں سے وابستہ ملازمین یا افراد کو بھی مراعات اور سہولیات فراہم کرے۔

اس بجٹ کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ حکومت کی طرف سے صنعتوں میں اضافے اور روزگار فراہم کرنے کے کسی منصوبہ کا تذکرہ موجود نہیں۔ نہ ہی حکومتی سطح پر صنعتوں کے قیام کا منصوبہ نظر آتا ہے اور نہ ہی ایسی ترغیبات نظر آتی ہیں کہ جس کے تحت صنعتوں کا قیام عمل میں آئے اور ملک کی پیداواری صلاحیت میں اضافہ ہو۔ پیداواری شعبہ کے فروغ اور استحکام کے بغیر ملک کی اقتصادی ترقی ناممکن ہے۔ عالمی مالیاتی اداروں سے مشاورت اور فرماں برداری کے نتیجہ میں معاشی خودمختاری کا حصول ناممکن ہے کیونکہ یہ ادارے ایسی پالیسیاں نافذ کرواتے ہیں جس سے ملک کی اقتصادی حالت کی بہتری ممکن ہی نہیں کیونکہ یہ نجکاری، درآمدی ٹیکسوں میں کمی، آزاد تجارت کی پالیسیوں کو فروغ دینے کے لیے مقامی اشرافیہ کو اپنے ساتھ ملاتے ہیں جس کے نتیجہ میں پاکستان جیسی کئی معیشتیں ایجنٹ (بروکر) کا کردار ادا کرنے پر مجبور ہیں۔ درآمدی اشیاء پر ٹیکس کی مد میں ملک کو خطیر رقم حاصل ہوسکتی ہے اور دوسری طرف ملکی صنعت کو تحفظ بھی فراہم کیا جاسکتا ہے مگر قرضوں کے بدلے جو شرائط مسلط کی جاتی ہیں اس شکنجے میں ہلا بھی نہیں جاسکتا۔

یہ ایک المیہ سے کم نہیں کہ بجٹ کا بہت بڑا حصہ قرضوں کی واپسی اور دفاعی اخراجات پر مشتمل ہوتا ہے۔ لگتا ہے کہ بجٹ بنانے کا مقصد نہ ملک کی خوشحالی سے ہے اور نہ ہی عوامی فلاح اسی لیے تعلیم اور صحت جیسی بنیادی سہولتوں کی فراہمی پر بجٹ میں انتہائی کم وسائل مختص کیے جاتے ہیں۔

وزیر خزانہ نے اپنی تقریر میں توانائی کے شعبے پر توجہ مرکوز رکھی۔ سب سے زیادہ رقم داسو پن بجلی منصوبے کے لیے 52 بلین روپے مختص کیے گئے ہیں۔ دیا میر بھاشا ڈیم کے لیے 21 بلین اور نیلم جہلم اور تربیلہ ڈیم کے توسیعی منصوبے کے لیے 11 بلین روپے مختص کیے گئے ہیں۔ حکومت بجلی کے لیے قانون سازی کا عندیہ دیتی نظر آتی ہے۔ لگتا ہے کہ بجلی کے نرخوں کو اس حد تک مہنگا کرنے کا ارادہ ہے کہ عوام متبادل ذرائع مثلاً شمسی توانائی (سورج کی روشنی سے حاصل کردہ بجلی)، ونڈ انرجی (ہوا سے بننے والی بجلی) اور دیگر ذرائع کے استعمال پر مجبور ہو جائیں۔ ایک طرف نجی شعبے کے لیے توانائی کے شعبے میں سرمایہ کاری کرنے پر پرکشش مراعات کا اعلان کیا جارہا ہے اور دوسری طرف حکومت توانائی کے مختلف منصوبوں پر عمل درآمد کا اشارہ دے رہی ہے۔ یہ سمجھ سے بالا تر ہے کہ اگر سرکار بجلی کی ضرورتوں کو پورا کرنے کی اہلیت رکھتی ہے تو پھر کیوں کرائے کے بجلی گھر اور بجلی کے شعبے میں بیرونی سرمایہ کاری کی ترغیب دے رہی ہے؟

توانائی کے مختلف منصوبوں کی تفصیل جدول 5 میں دی جارہی ہے۔

جدول 5: توانائی کے شعبے میں جاری منصوبے

شعبہ	رقم (بلین روپے)
داسو پن بجلی منصوبہ (2160 میگاواٹ)	52
دیا میر بھاشا ڈیم (4,500 میگاواٹ)	21
نیلم جہلم منصوبہ (969 میگاواٹ)	11
تربیلہ چوتھا توسیعی منصوبہ (1410 میگاواٹ)	11
گدو پاور پروجیکٹ منصوبہ (747 میگاواٹ)	5

بحوالہ: سینیٹر محمد اسحاق ڈار وفاقی وزیر برائے خزانہ، مالیات، 16-2015، صفحہ 47۔ (اردو تقریر)

اپنی بجٹ تقریر میں ٹیکسٹائل پیکیج کے اعلان کے دوران وزیرخزانہ نے اس صنعت سے وابستہ افراد کے لیے مراعات کے اعلان کے علاوہ یہ خطرناک خبر بھی خوشخبری کے انداز میں سنائی کہ '' حکومت بیج کی جدید ترین ٹیکنالوجی متعارف کرانے کا پختہ ارادہ رکھتی ہے۔ اس سلسلے میں سیڈ ایکٹ قومی اسمبلی سے منظور ہوچکا ہے جبکہ پلانٹ بریڈرز رائٹس ایکٹ بھی ترجیحی بنیادوں پر نافذ کیا جائے گا''۔[13] پچھلے سال بجٹ تقریر 2014-15 کے دوران وزیرخزانہ نے اسی بات کا عندیہ کچھ اس طرح دیا تھا کہ ''بی ٹی کپاس کو فروغ دینے کے لیے ضروری ضوابط کی منظوری دی جائے گی۔ معیاری بیج کی فراہمی یقینی بنانے کے لیے سیڈ ایکٹ 1976 میں تبدیلی کی جائے گی''۔[14]

موجودہ حکومت کے بارے میں جو خدشات تھے وہ اب کھل کر عیاں ہوتے جارہے ہیں۔ بیج کے حوالے سے قانون سازی پر حکومت کی مستقل مزاجی واضح ہے۔ یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ امریکی امدادی ادارہ یو ایس ایڈ اور دیگر زرعی بین الاقوامی کمپنیاں اس بات کا اظہار کرتی رہی ہیں کہ 1976 کا بیج کا قانون پاکستانی منڈی میں ان کی رسائی مشکل بناتا ہے اس لیے اس قانون میں ترامیم کی ضرورت ہے۔ سیڈ ایکٹ جو کہ ایک انتہائی خطرناک قانون ہے۔ یہ ملک کی کسان آبادیوں کے روزگار کے لیے سب سے اہم وسیلہ بیج پر کمپنیوں کے قبضے اور کسانوں سے بیج کی ملکیت چھیننے کے لیے قانونی طریقہ نکالا گیا ہے۔

چین - پاکستان اقتصادی راہداری (China Pakistan Economic Corridor/CPEC) کا ذکر کرتے ہوئے وزیرخزانہ نے کہا کہ 46 بلین ڈالرز مالیت سے سڑکوں، ریلوے، ٹیلی کام، گوادر کی بندرگاہ اور توانائی کے مختلف منصوبوں کی تعمیر کے تاریخی معاہدے پر دستخط ہوگئے ہیں۔ CPEC (سی پی ای سی) چین اور پاکستان کے ساتھ ساتھ خطے کو جوڑنے کی اہم بنیاد ہے۔[15] حیرت انگیز بات یہ ہے کہ سی پی ای سی کے تعمیراتی کام کے لیے موجودہ بجٹ میں رقم بھی مختص کی گئی ہے۔ یہ بات سمجھ سے بالا تر ہے کہ جب 46 بلین ڈالرز کی خطیر رقم اس منصوبے کے لیے موجود ہے تو پھر کیوں حکومت اس ضمن میں رقم بجٹ سے مختص کررہی ہے۔ سی پی ای سی کے پروگرام میں شامل چند اہم منصوبے مندرجہ ذیل ہیں:[16]

- پورٹ قاسم پر کوئلے سے 660 میگاواٹ بجلی بنانے کے دو منصوبے (Independent Power Producer/IPP)۔
- ٹیاری سے قومی گرڈ کو بجلی کی ترسیل (IPP)۔
- تھر بلاک -II منصوبے میں 3.5 میٹرک ٹن کوئلہ نکالنے اور 330 میگاواٹ بجلی پیدا کرنے کے دو منصوبے۔
- بہاول پور میں شمسی توانائی کا پارک۔
- پانی سے 2793 میگاواٹ بجلی بنانے کے تین منصوبے۔
- کراچی لاہور موٹر وے کا ملتان سے سکھر 387 کلومیٹر کا منصوبہ۔
- شاہراہ قراقرم کا دوسرا مرحلہ۔ رائی کوٹ سے اسلام آباد۔
- فائبر آپٹک۔
- کراچی سے پشاور براستہ لاہور (ML-1) ریلوے پٹری کی بحالی۔
- گوادر پیکیج۔
- گوادر کے مقام پر 18.98 کلومیٹر کا ایسٹ بے ایکسپریس وے کا منصوبہ۔
- جھمپیر کے مقام پر ہوا سے 200 میگاواٹ بجلی پیدا کرنے کا منصوبہ۔
- ساہیوال میں کوئلے سے 660 میگاواٹ بجلی بنانے کے دو منصوبے۔
- گڈانی میں IPP (آئی پی پی) یا سرکاری طور پر چبوترا (Jetty) اور انفرا اسٹرکچر (Infrastructure) کا قیام۔

سی پی ای سی کے مجموعی 46 بلین ڈالرز میں سے تقریباً 33 بلین ڈالرز توانائی کے مختلف منصوبوں پر خرچ کیے جائیں گے جن میں کوئلہ، ہوا، پانی اور سورج سے بجلی حاصل کرنے کے منصوبے شامل ہیں۔ انفرا اسٹرکچر کی مد میں تقریباً 12 بلین ڈالرز مختص کیے گئے ہیں۔[17]

سی پی ای سی کے لیے مختص مالی وسائل کو سامنے رکھتے ہوئے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ اس شراکت داری سے چین اپنے معاشی مفادات کو فروغ دینا چاہتا ہے جس کے تحت اسے وسطی ایشیاء تک براہ راست رسائی حاصل ہوسکے گی۔ 33 بلین ڈالرز کی خطیر رقم توانائی کے شعبے میں کیوں لگائی جارہی ہے؟ جبکہ اس سے کہیں کم مالی وسائل سے پاکستان میں توانائی کی کمی کو پورا کیا جاسکتا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ چین پاکستان میں توانائی پیدا کرکے وسطی اشیائی ممالک کو فروخت کرے گا؟ یقیناً اس سے صرف چینی معیشت فروغ پائے گی اور پاکستانی معیشت چینی سامراج کے زیر سایہ ہمیشہ کی طرح کمزور رہے گی۔

تبصرہ

مالی بجٹ 2015-16 کا تنقیدی جائزہ لیا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ اس بجٹ کی تیاری میں آئی ایم ایف سے کیے گئے وعدوں اور ان کی شرائط کو مدنظر رکھا گیا ہے اور ان تمام دستیاب وسائل کو استعمال کیا گیا ہے جن سے عوام کا خون چوسا جاسکے۔ یاد رہے کہ بجٹ 5 جون، 2015 کو پیش کیا گیا جبکہ 26 جون، 2015 کو آئی ایم ایف کی اگلی قسط جاری ہونی تھی۔ کچھ حلقوں کا کہنا ہے کہ بجٹ کی حتمی شکل دیکھنے کے بعد ہی آئی ایم ایف اگلی قسط جاری کرے گا۔ اس لیے توقع یہی ہے کہ پیش کردہ بجٹ میں حکومت نے آئی ایم ایف سے کیے گئے تمام وعدوں کی تکمیل کی ہوگی۔[18]

ملکی معیشت کا استحکام پیداواری شعبے میں استحکام سے جڑا ہوا ہے لیکن پاکستانی معیشت دان ملکی معیشت میں صنعت کی ترقی کے بجائے جس سے بڑے پیمانے پر روزگار اور معیشت میں ترقی ممکن ہے، خدمات اور درآمدی شعبوں پر توجہ مرکوز کیے ہوئے ہیں۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ پچھلے مالی سال 2014-15 کے پہلے 10 ماہ میں مجموعی برآمدات 20.1 بلین ڈالرز تھی جبکہ بیرون ملک مقیم پاکستانیوں کی بھیجی

جانے والی رقم تقریباً 15 بلین ڈالرز تھی۔ یہ ایک انتہائی تشویشناک پہلو ہے کہ مجموعی برآمدات، بیرون ملک پاکستانیوں کی جانب سے بھیجی جانے والی رقم کے مقابلے میں تقریباً پانچ بلین روپے زیادہ تو ہے مگر اس انتہائی کم فرق کے بدلے پاکستان عالمی مالیاتی اداروں مثلاً آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کی کڑی شرائط جس میں مراعات میں کمی، زرتلافی کا خاتمہ، نجکاری اور ٹیکسوں میں اضافے جیسے خطرناک شرائط شامل ہیں کی عمل درآمد کو یقینی بناتا ہے جو کہ حالیہ بجٹ سے بھی واضح ہے۔ ایک اور قابل ذکر پہلو یہ ہے کہ یورپی یونین کی جانب سے دسمبر 2013 میں پاکستان کو جی ایس پی پلس کا درجہ دیا گیا جس کے تحت توقع یہ تھی کہ پاکستانی برآمدات میں خاطر خواہ اضافہ ہوگا مگر اس کے باوجود 2013-14 کے مقابلے میں 2014-15 میں برآمدات میں 3.2 فیصد کی کمی واقع ہوئی۔[19] پاکستان عالمی منڈی تک رسائی کی لالچ میں ڈبلیو ٹی او کی ناانصافیوں پر مبنی پالیسیوں کو گلے لگاتا ہے اور ٹرپس (TRIPs) جیسے انتہائی خطرناک معاہدوں پر عمل درآمد کے لیے قانون سازی تک کرنے سے گریز نہیں کرتا مگر اس کے باوجود پاکستانی برآمدات میں اضافہ نہ ہونا اس بات کا کھلا اشارہ ہے کہ پاکستانی معیشت کو ڈبلیو ٹی او کے تحت کثیرالجہتی تجارتی نظام (Multilateral Trading System) سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوگا بلکہ پہلے سے موجود معاشی استحکام میں روز بروز کمی واقع ہوگی۔ اس لیے حکمرانوں کو مقامی صنعت کو فروغ دیتے ہوئے مقامی معیشت کو استحکام دینے کی ضرورت ہے تاکہ ہماری معیشت اپنے پاؤں پر کھڑی ہوسکے۔

بہتر طرز حکمرانی اور عوامی فلاح کا تصور عالمگیریت کے اس دور میں قصہ پارینہ بن چکا ہے۔ سرمایہ داری اپنے آپ کو مضبوط سمجھتے ہوئے اصل ہتھکنڈوں پر اتر آئی ہے۔ اس لیے زرتلافی کا خاتمہ، مفت علاج معالجہ، تعلیم اور انسانی ترقی کے لیے دیگر ترجیحات کو یکسر نظرانداز کردیا گیا ہے کیونکہ مدمقابل کوئی اور نظام خطرے کے طور پر موجود نہیں مگر یورپ میں مالیاتی بحران اور دیگر بیل آؤٹ پلان (Bailout Plan) اس بات کا ثبوت ہیں کہ اس نظام کا وجود برقرار رکھنا مشکل ہوتا جارہا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ پسے ہوئے طبقات مثلاً مزدور و کسان اپنے حقوق کے حصول کے خاطر منظم ہوں تاکہ موجودہ حالات کا ادراک کرتے ہوئے ایک ایسے مزاحمتی عمل کا آغاز کیا جاسکے جس سے معاشی و معاشرتی حالات میں عوام دوست تبدیلی ممکن بنائی جاسکے۔ اب تو یورپ میں سرمایہ داری کے تحت دی جانے والی سہولیات اور مراعات کا خاتمہ ہورہا ہے۔ ان حالات میں سرکار اور عالمی اداروں کی طرف سے نام نہاد مدد کی کوئی امید بے سود ثابت ہوگی۔ اس لیے صرف اور صرف جدوجہد کے نتیجے میں ہی حقوق چھینے جاسکتے ہیں ورنہ پچھتاوا ہی نصیب ہوگا۔

حوالہ جات

1۔ سینیٹر محمد اسحاق ڈار وفاقی وزیر برائے خزانہ، مالیات، بجٹ تقریر 2014-15، صفحہ 2۔
Accessed from http://finance.gov.pk/budget/Budget_Speech_14_15_urdu.pdf

2. IMF. "Pakistan Letter of Intent, Memorendum of Understanding." December 5, 2013, p. 8,11. Accessed from https://www.imf.org/external/np/loi/2013/pak/120513.pdf

3۔ سینیٹر محمد اسحاق ڈار وفاقی وزیر برائے خزانہ، مالیات، بجٹ تقریر 2015-16، 5 جون، 2015، صفحہ 2۔
Accessed from http://www.finance.gov.pk/budget/budget_speech_urdu_2015_16.pdf

4. Ibid, p. 3, 5.

5. Ibid, p. 10, 11.

6. International Monetary Fund. "Pakistan: Letter of Intent, Memorandum of Economic and Financial Policies, and Technical Memorandum of Understanding." March 12, 2015, p. 12. Accessed from https://www.imf.org/external/np/loi/2015/pak/031215.pdf

7۔ سینیٹر محمد اسحاق ڈار وفاقی وزیر برائے خزانہ، مالیات، بجٹ تقریر 2015-16، 5 جون، 2015، صفحہ 47۔
Accessed from http://www.finance.gov.pk/budget/budget_speech_urdu_2015_16.pdf

8. Kundi Imran Ali. "Govt all set to privatise three power companies." The Nation, 17 June, 2015.

9. Government of Pakistan. "Pakistan Economic Survey 2013-14." p. 131. Accessed from http://www.finance.gov.pk/survey/chapters_14/09_Public_Debt.pdf

10. PkRevenue.Com. "Karachi Chamber slams increase in K-Electric tariff up to 30 percent for residential consumers." PkRevenue.Com, August 21, 2015. Accessed from http://www.pkrevenue.com/finance/karachi-chamber-slams-increase-in-k-electric-tariff-up-to-30-percent-for-residential-consumers/

11. Ahmed Dawood. "A guide to understanding the budget in Paksitan." Parliament of Pakistan, June 2007. p. 8.

12۔ سینیٹر محمد اسحاق ڈار وفاقی وزیر برائے خزانہ، مالیات، بجٹ تقریر 2015-16، 5 جون، 2015، صفحہ 14۔
Accessed from http://www.finance.gov.pk/budget/budget_speech_urdu_2015_16.pdf

13۔ ایضاً، صفحہ 31۔

14۔ سینیٹر محمد اسحاق ڈار وفاقی وزیر برائے خزانہ، مالیات، بجٹ تقریر 2014-15، صفحہ 24۔
Accessed from http://finance.gov.pk/budget/Budget_Speech_14_15_urdu.pdf

15۔ ایضاً، صفحہ 25۔

16. Senator Ishaq Dar, Federal Minister for Finance, Budget Speech 2015-16, June 5, 2015, p 21. http://www.finance.gov.pk/budget/budget_speech_english_2015_16.pdf

17. Reuters. "China commits $45.6 billion for economic corridor with Pakistan." The Express Tribune, November 21, 2014.

18. Ibrahim Anjum. "Budget 2015-16: What can we expect." Business Recorder, June 1st, 2015. p. 16.

19۔ سینیٹر محمد اسحاق ڈار وفاقی وزیر برائے خزانہ، مالیات، بجٹ تقریر 2015-16، 5 جون، 2015، صفحہ 4۔
Accessed from http://finance.gov.pk/budget/Budget_Speech_14_15_urdu.pdf

مال مویشی شعبے پر بین الاقوامی کمپنیوں کا قبضہ

تحریر: جنید احمد

پاکستان ایک زرعی ملک ہے، جس کی تقریباً 70 فیصد آبادی زراعت سے وابستہ ہے۔ مجموعی قومی پیداوار میں مال مویشی شعبے کا حصہ 11.8 فیصد ہے جبکہ مجموعی زرعی پیداوار میں مال مویشی کا حصہ 56.3 فیصد ہے۔[1] اس لیے ملکی معیشت اور غذائی تحفظ کے لیے مال مویشی کا شعبہ انتہائی اہمیت کا حامل ہے جو ملک میں اس شعبے سے جڑی صنعت وتجارت کی ترقی کے لیے بھی لازم ہے۔

ادارہ شماریات پاکستان کا ذیلی ادارہ ایگریکلچر سینسس ونگ (Agriculture Census Wing) ملک میں مال مویشیوں سے متعلق اعداد وشمار جمع کرتا ہے۔ ادارے نے اب تک ہر دس سال بعد چار مرتبہ مال مویشیوں کی شماری مہم سرانجام دی ہے۔ پہلا شمار 1976، دوسرا شمار 1986، تیسرا شمار 1996، چوتھا شمار 2006 میں کیا گیا۔[2] پاکستان میں آٹھ ملین سے زیادہ دیہی خاندان مال مویشی پالتے ہیں۔ درج ذیل جدول-1 میں ملک میں مویشیوں کی تعداد فراہم کی گئی ہے۔

جدول: 1

مال مویشیوں کی تعداد (15-2014)

مویشی	تعداد (ملین میں)
بکری	68.4
گائے	41.2
بھینس	35.6
بھیڑ	29.4
گدھا	5.0
اونٹ	1.0
گھوڑا	0.4
خچر	0.2
کل مویشی	181.2

پاکستان اکنامک سروے 15-2014

اعداد وشمار سے واضح ہے کہ ملک بھر میں پالے جانے والے مویشیوں میں سب سے زیادہ تعداد بکریوں کی ہے اور روزگار کے حوالے سے مویشیوں کی پہلی چار اقسام (بکری، گائے، بھینس اور بھیڑ) کی اہمیت کے پیش نظر مضمون میں مویشیوں کی ان چار اقسام کو موضوع بنایا گیا ہے۔ یہ چاروں اقسام کے مویشی دودھ، گوشت، چمڑا اور اون کی پیداوار کے لیے استعمال ہوتے ہیں اور زرعی پیداوار کے لیے اہم مداخل گوبر بھی فراہم کرتے ہیں۔

پاکستان میں دیہی آبادی کے لیے چاہے وہ زمین رکھنے والے چھوٹے کسان ہوں یا بے زمین کسان مزدور، مویشی ان کے لیے ایک محفوظ سرمائے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مال مویشیوں کے ذریعے دیہی خاندانوں کی یومیہ بنیادوں پر کچھ غذائی اور دیگر ضروریات بھی پوری ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ بوقت ضرورت انہیں فروخت بھی کیا جاسکتا ہے جس سے قرضوں کی واپسی اور شادی بیاہ جیسے اخراجات پورے کیے جاتے ہیں۔ پاکستان میں مال مویشی کا شعبہ تین اقسام کے پیداواری طبقات (پروڈیوسرز) پر مشتمل ہے۔ چھوٹے کسان، درمیانے درجے کے مویشی پالنے والے کسان اور بڑے پیمانے پر مویشی پالنے والے کاروباری حضرات۔ 80 فیصد مویشی پالنے والے پہلے درجے سے تعلق رکھتے ہیں یعنی چھوٹے کسان ہیں جن کے پاس مویشیوں کی اوسط تعداد پانچ سے کم ہے۔[3]

ملک میں مویشیوں کی پائی جانے والی اتنی بڑی تعداد کی وجہ سے پاکستان مویشیوں کے لیے نہ صرف چارے، ادویات اور افزائش نسل کے لیے درکار مصنوعات کی ایک بڑی منڈی ہے بلکہ دودھ اور دودھ سے تیار شدہ مصنوعات بنانے والی کمپنیوں کے لیے بھی پاکستان خام مال فراہم کرنے کے لیے ایک اہم ترین خطہ ہے۔ عالمی سطح پر توانائی کے بحران اور نئے طریقوں سے ایندھن حاصل کرنے کے حوالے سے اب مال مویشیوں کا گوبر بھی توانائی پیدا کرنے کے حوالے سے نہایت اہمیت اختیار کرچکا ہے۔ اس حوالے سے اس شعبے کے کچھ اہم ذیلی شعبوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔

مویشیوں کا چارہ

کسانوں کے لیے جہاں مال مویشی خوراک کے ساتھ ساتھ ایک اہم ترین روزگار کا زریعہ ہے وہیں ان کے لیے مویشیوں کی خوراک حاصل کرنا ایک بہت بڑا مسئلہ ہے۔ چونکہ مویشی پالنے والے کسانوں کی بڑی تعداد یا تو بے زمین ہے یا کم زمین رکھتی ہے اس لیے کسانوں کی اکثریت کو سبز چارہ، بھوسا اور دیگر غذائی اجناس خریدنے پڑتے ہیں۔

مویشیوں کی غذائی ضروریات پوری کرنے کے لیے ملک میں کل زیر کاشت رقبے 21.85 ملین ہیکٹر میں سے 3.35 ملین ہیکٹر پر 60 ملین ٹن چارہ پیدا ہوتا ہے۔[4] چارے کی ان فصلوں میں ربیع کے سیزن میں مصری گھاس (برسیم)، الفا الفا، جو وغیرہ

اورخریف کے سیزن میں باجرا، سدا بہار، جنتر، گوار، سورغم، مکئی وغیرہ شامل ہیں۔ اس کے علاوہ پاکستان میں دیگر فصلوں سے سالانہ 40 ملین ٹن بھوسہ اور گھاس حاصل ہوتا ہے جس کا 50 فیصد چاول اور 20 فیصد گندم فصل سے حاصل ہوتا ہے۔[5] اس کے علاوہ پاکستان کپاس پیدا کرنے والے بڑے ممالک میں شامل ہے۔ کپاس کے بیج سے تیل نکالنے کے بعد بچ جانے والا کھل بھی مویشیوں کی اہم غذا ہے۔

روایتی کھیتی باڑی میں مال مویشیوں کے لیے قدرت سے حاصل ہونے والے چارے پر ہی گزر بسر کیا جاتا ہے۔لیکن جیسے جیسے سرمایہ داری مال مویشی کے شعبے میں قدم جمارہی ہے مذکورہ بالا مویشیوں کے لیے سبز چارہ اور دیگر روایتی خوراک کے علاوہ مویشیوں کے دودھ اور گوشت کی پیداوار میں اضافے کے لیےمختلف اقسام کا مقامی اور غیرملکی چارہ بھی ملک میں دستیاب ہونا شروع ہوگیا ہے۔ تیار شدہ چارے کو عموماً ونڈہ کہا جاتا ہے جس میں 20 فیصد لحمیات (protien) ہوتے ہیں۔ ونڈہ مکئی کی فصل سے بھی تیار کیا جاتا ہے جسے کسان خود بھی تیار کرسکتے ہیں اور منڈی میں بھی باآسانی دستیاب ہے۔ اس کے علاوہ مویشیوں سے حاصل ہونے والی دودھ کی پیداوار کے حساب سے کئی ملکی اور غیرملکی خوراک بھی دستیاب ہیں جنہیں سبز چارے کے ساتھ ملا کرمویشیوں کوکھلائی جاتی ہے جس سے ان کی دودھ اور گوشت کی پیداوار میں اضافہ کرنا مقصود ہوتا ہے۔ پاکستان میں کئی کمپنیاں اس قسم کی غیرملکی خوراک فروخت کررہی ہیں جو پاکستان میں غیرملکی کمپنیوں کی تقسیم کار ہیں۔کمپنیوں کی تیارکردہ خوراک میں مخصوص تناسب سے نمکیات،لحمیات دیگر غذائی اجناس مویشی کی دودھ کی پیداوار کے حساب سے شامل کیے جاتے ہیں جیسے ملک میکس پلس، ملک میکس اور اسپرے فو بلو(Spray fo blue)۔کمپنیوں کی تیار شدہ چند خوراک، اس کی خصوصیات اور قیمت درج ذیل ہے۔

- ملک میکس پلس: ان مویشیوں کے لیے جن کی دودھ کی پیداوار بیس لیٹر سے زیادہ ہے۔ تجویز کردہ خوراک تقریباً دوکلو روزانہ ہے۔ 35 کلوگرام وزن پر مبنی بوری کی قیمت 1,320 روپے ہے اور یومیہ لاگت 75 روپے بنتی ہے۔
- ملک میکس: ان مویشیوں کے لیے جن کی دودھ کی پیداوار 12 سے 20 لیٹر ہے۔ تجویز کردہ خوراک تقریباً دوکلو روزانہ۔ 35 کلوگرام وزن پر مبنی بوری کی قیمت 1,260 روپے ہے اور یومیہ لاگت 72 روپے بنتی ہے۔
- ایچ وائی ایف: ان مویشیوں کے لیے جن کی دودھ کی پیداوار 12 لیٹر سے کم ہے۔ تجویز کردہ خوراک تقریباً دوکلو روزانہ۔ 37 کلوگرام وزن پر مبنی بوری کی قیمت 1,210 روپے ہے اور یومیہ لاگت 65 روپے بنتی ہے۔
- اسپرے فو بلیو(Spray fo blue): ہالینڈ سے درآمد شدہ یہ خوراک بچھڑے کو دیے جانے والے چارے میں شامل کی جاتی ہے جس سے بچھڑے کو بھینس یا گائے کا دودھ پلانے کی ضرورت نہیں رہتی۔ 25 کلوگرام وزن پر مبنی بوری کی قیمت 8,300 روپے ہے اور بچھڑے کی عمر کے مطابق 200 گرام سے 800 گرام تجویز کی جاتی ہے۔ اگر اوسط 500 گرام شمار کریں تو یومیہ لاگت 166 روپے بنتی ہے۔[6]

پاکستان نے جولائی تا مارچ 2014-15 درآمدی ڈیوٹی سے مستثنٰی 15184.175 ٹن بچھڑوں کے لیے دودھ کی متبادل خوراک (calf milk replacer) اور 261.050 ٹن چارے میں غذائیت بڑھانے والی خوراک (کیٹل فیڈ پری مکس) درآمد کی۔[7]

افزائش نسل

مال مویشی شعبے کی ترقی، مقامی نسل میں جینیاتی طور پر بہتری لانے اور زیادہ پیداوار کے لیے پاکستان میں غیرملکی مال مویشیوں کی نسل کا مادہ منویہ بھی درآمد کیا جاتا ہے۔ ملٹی نیشنل کمپنیوں کی تقسیم کار چارہ فروخت کرنے والی تجارتی کمپنیاں ہی پاکستان میں مادہ منویہ بھی فروخت کرتی ہیں۔ یہ کمپنیاں غیرملکی مادہ منویہ کی ایک خوراک 5,000 روپے سے 7,000 روپے میں فروخت کرتی ہیں جبکہ مقامی فارم کا تیارکردہ مادہ منویہ کی خوراک 500 سے 1,000 میں بھی دستیاب ہوتی ہے۔ اکنامک سروے آف پاکستان 2014-15 کے مطابق پاکستان نے جولائی تا مارچ 2014-15 کے دوران 142,200 مادہ منویہ کی خوراک اور 4,246 خاص نسل کی گائیں درآمد کیں جن سے دودھ کی پیداوار میں 26,538 ٹن سالانہ اضافہ ہوا۔[8]

دودھ کی پیداوار

پاکستان دنیا میں دودھ پیدا کرنے والا پانچواں بڑا ملک ہے۔ سال 2014-15 میں مجموعی طور پر ملک میں دوددھ کی پیداوار 52,632,000 ٹن تھی[9] جس کا 80 فیصد دیہات میں قائم چھوٹے چھوٹے باڑے پیدا کرتے ہیں۔کل پیداوار کا 90 فیصد دودھ بغیر کسی تبدیلی اور اضافہ کیے روایتی طریقوں سے ترسیل کیا جاتا ہے اور ملک بھر میں تقریباً 55 ملین چھوٹے اور بے زمین کسان دودھ کی ترسیل اور پیداوار سے منسلک ہیں۔ مویشیوں کی شماری مہم 2006 کے مطابق 1996 سے 2006 کے دوران ملک میں دودھ کی پیداوار میں 36 فیصد اضافہ ہوا۔[10]

گوشت کی پیداوار

پاکستان گوشت پیدا کرنے والا دنیا کا نواں بڑا ملک ہے۔[11] ملک میں گوشت کی مجموعی پیداوار 3,696,000 ٹن ہے۔[12] جولائی تا مارچ 2014-15 پاکستان نے 340.518 ملین ڈالرز مالیت کے زندہ جانور، انڈے، گوشت اور دیگر متعلقہ مصنوعات

برآمد کیں۔[13]

مال مویشیوں کے شعبے میں جاری منصوبے

پاکستان میں مال مویشیوں کی صحت، غذا، ان کی نسل میں بہتری اور پیداوار میں اضافے کے حوالے سے تحقیق اور تعلیم کے لیے متعدد سرکاری اور غیر سرکاری ادارے اور جامعات میں جانوروں کی صحت (ویٹری) کے شعبے قائم ہیں جن میں نیشنل ویٹری لیبارٹریز اسلام آباد، زرعی یونیورسٹی فیصل آباد، زرعی یونیورسٹی ٹنڈوجام، یونیورسٹی آف ویٹری اینڈ اینمل سائنسیز لاہور، بقائی میڈیکل یونیورسٹی کراچی، بہاوالدین زکریا یونیورسٹی ملتان، خیبر پختون خواہ ایگریکلچرل یونیورسٹی پشاور، لسبیلہ یونیورسٹی آف ایگریکلچر واٹر اینڈ میرین سائنسس لسبیلہ قابل ذکر ہیں۔ پاکستان کو ان یونیورسٹیوں میں جاری تحقیقی و علمی سرگرمیوں اور محکمہ جات کے قیام کے لیے امریکی امداد فراہم کرنے والے ادارے یو ایس ایڈ اور دیگر عالمی اداروں سے امداد بھی ملتی ہے۔ رواں سال فروری میں یو ایس ایڈ اور یونیورسٹی آف ویٹری اینڈ اینمل سائنسیز، لاہور نے ایک اجلاس میں ایک ادارے سینٹر فار اپلائیڈ پالیسی ریسرچ ان لائیو اسٹاک (CAPRIL) کے قیام اور دیہی نوجوانوں کی مال مویشیوں کے شعبے میں تربیت کے آغاز کے لیے دو مفاہمت کی یاداشتوں پر دستخط کرنے پر اتفاق کیا ہے۔[14]

ڈیری پروجیکٹ:[15]

پاکستان میں مال مویشی شعبے میں جدت اور پیداوار میں اضافے کے لیے یو ایس ایڈ کی مالی امداد سے ڈیری اینڈ رورل ڈیولپمنٹ فاؤنڈیشن (DRDF) نے جولائی 2011 سے اکتوبر 2016 کے دورانیے پر مشتمل ایک منصوبہ ''ڈیری پروجیکٹ'' غذائی کمپنی نیسلے کے اشتراک سے شروع کیا جس کے پانچ بنیادی اہداف مندرجہ ذیل ہیں۔

1۔ مویشیوں کے باڑوں کو جدید بنانا اور بائیو گیس پلانٹ نصب کرنا۔

پنجاب میں جون، 2015 تک آٹھ باڑوں کو مثالی فارم بنایا گیا تاکہ اردگرد کے مزید باڑے اس کی تقلید کریں۔ اس کے علاوہ بائیو گیس پلانٹ نصب کرنے کا مقصد تھا کہ اس سے حاصل شدہ توانائی سے ٹیوب ویل اور دودھ ٹھنڈا کرنے کی مشین چلائی جاسکے۔

2۔ مال مویشی رکھنے والے کسانوں کو تربیت اور مدد فراہم کرنا۔

اس تربیت کا مقصد کسانوں کو مویشی پالنے کے جدید طریقوں سے روشناس کرواکر دودھ کی پیداوار میں اضافہ اور انہیں باڑے کے انتظامی امور کی تربیت دینا تھا۔ ایک ماہ کے تربیتی نصاب میں کسانوں کو مویشیوں کی خوراک اور پیداوار کے لیے مندرجہ ذیل تجاویز دی گئیں۔

- کسان مویشیوں کی غذائی ضروریات کے لیے مکئی سائیلج بنائیں تاکہ کسان خود ونڈہ تیار کرسکیں۔ سائیلج زیرزمین یا زمین پر پکی اینٹوں سے بنکر کی صورت بنائیں۔ مکئی کی فصل کو مکمل طور پر کتر کے اس طرح ذخیرہ کریں کہ اس میں ہوا داخل نہ ہو اور اس چارے میں خمیر کا عمل شروع ہو جائے۔ سائیلج میں مکئی کا ونڈہ چالیس دن میں تیار ہوجانا چاہیے۔
- دودھ دینے والے مویشیوں کے بچھڑوں کو دودھ کی متبادل غذا مخصوص ونڈہ (calf milk replacer) کھلائیں جس کا استعمال ترقی یافتہ ممالک میں عام ہے۔ بچھڑوں کو یہ خوراک دینے سے اس دودھ کی بچت ہوتی ہے جو بچھڑے پیتے ہیں اور اسی دودھ کو فروخت کرکے منافع میں اضافہ کیا جاسکتا ہے۔
- مویشیوں کو کھل نہ کھلائیں کیونکہ کھل میں وہ زہریلی ادویات شامل ہوتی ہے جن کا فصلوں پر چھڑکاؤ کیا جاتا ہے۔ معیاری اور متوازن ونڈہ مویشیوں کو کھلائیں اور دودھ میں روغنی اجزاء کے تناسب کو مدنظر رکھ کر خوراک کھلائیں۔
- ونڈہ مویشی کے دودھ کی پیداوار کے آدھے وزن کے برابر کھلائیں یعنی مویشی آٹھ کلو دودھ روزانہ دے تو چار کلو ونڈہ کھلائیں۔
- چارے کے لیے مکئی کے ہائبرڈ بیج (32BCC، 32W86 اور 3062) استعمال کریں جن سے سال میں تین سے چار فصلیں لی جاسکتی ہیں۔
- مویشیوں کی خوراک میں یوریا بھی شامل کریں۔ ونڈہ، بھوسہ اور شیرے میں درست تناسب سے یوریا ملاکر کھلائیں۔ یوریا کی زیادتی کی صورت میں مویشی فوری طور پر ہلاک ہوسکتا ہے۔ مویشیوں کے 100 کلو بھوسے میں چار کلو یوریا شامل کریں۔
- پاکستان میں مویشیوں میں نمکیات کی کمی پائی جاتی ہے خاص کر فاسفورس کی کمی دور کرنے کے لیے چارے کی کاشت کے دوران زمین میں فاسفورس کھاد استعمال کریں تاکہ چارے اور دیگر اجناس میں نمکیات کی کمی پوری ہوسکے۔
- سبز چارہ مویشی کے وزن کا دس فیصد کھلائیں یعنی دوسوکلو کے مویشی کو روزانہ بیس کلو چارہ دینا چاہیے۔
- گائے اور بھینسوں کی افزائش نسل کے لیے مصنوعی طریقہ استعمال کریں اور کم دودھ دینے والی گائے کو غیر ملکی سانڈ کے مادہ منویہ کا ٹیکہ لگوائیں۔

3۔ افزائش نسل کے مصنوعی طریقہ کار کی تربیت اور مدد فراہم کرنا۔

اس پروگرام کے تحت جون 2015 تک مختلف دیہات کے 2,168 بیروزگار نوجوانوں

کو افزائش نسل کے مصنوعی طریقے کی تربیت دی گئی۔ DRDF (ڈی آر ڈی ایف) کے مطابق تربیت پانے والے افراد پاکستان بھر میں تقریباً 20,000 دیہات میں خدمات فراہم کرکے ماہانہ 9,371 روپے کماتے ہیں۔

4۔ مال مویشی پالنے والی عورتوں کی تربیت اور اس کے مقاصد۔

اس پروگرام کے تحت جون 2015 تک منتخب دیہات میں 5,523 عورتوں کوان کی آمدنی میں اضافے اور مویشیوں کی پیداوار میں اضافے کے لیے مال مویشیوں کی صحت، ان کو ٹیکے لگانے اور ان کا حساب کتاب رکھنے، بیماریوں سے بچاؤ اور ان کے علاج کی تعلیم و تربیت فراہم کی گئی۔ تربیت مکمل کرنے والی عورتوں کو باضابطہ طور پر یونیورسٹی آف ویٹری اینڈ اینمل سائنسز لاہور کی طرف سے (وومن لائیو اسٹاک ایکسٹنشن ورکر) سند فراہم کی گئی۔

تربیت کے مقاصد میں ان عورتوں کے زریعے ادویات کی فروخت، ونڈہ کی فروخت، بنیادی علاج معالجے کے زریعے مویشیوں کی صحت، پیداوار اور افزائش کی بہتری، دودھ اکھٹا کرنا، مرغبانی اور مال مویشی کے شعبے سے متعلق دیگر چھوٹے کاروبار کرنے کے طریقے سکھانا تھا تاکہ انہیں معاشی اعتبار سے خودمختار بنایا جاسکے۔ اس کے علاوہ زیر تربیت خواتین کو ڈیری اور زرعی کمپنیوں، اور غیر سرکاری تنظیموں سے بھی متعارف کروایا گیا۔ ڈی آر ڈی ایف کے مطابق اس منصوبے کے تحت ان خواتین نے 4,000 سے زیادہ دیہات میں خدمات انجام دے رہی ہیں جس سے وہ اندازاً 1,091 روپے ماہانہ کماتی ہیں۔

5۔ مال مویشی سے متعلق آگہی مہم

اس پروگرام کے تحت 20,000 دیہات میں دوملین مال مویشی پالنے والے گھرانوں کو بڑے پیانے پر موثر طریقے سے مویشی پالنے کے جدید اور فائدہ مند طریقوں سے روشناس کرانے کے لیے ویب سائٹ، موبائل فون پر پیغامات، معلوماتی مواد، بینروں، ورکشاپس اور سڑکوں پر ناٹک کے زریعے بھی آگاہی فراہم کی گئی۔

ایگری کلچر سیکٹر لنکج پروگرام[16] (ASLP)

آسٹریلوی حکومت کے مالی تعاون سے چھوٹے پیانے پر مال مویشی پالنے والوں کی پیداوار میں اضافے کے لیے آسٹریلیا کی یونیورسٹی، چارلس اسٹرٹ یونیورسٹی، یونیورسٹی آف ویٹری اینڈ اینمل سائنسز، لاہور کے اشتراک سے اس منصوبے پر کام کررہی ہے۔ دو مراحل پر مشتمل یہ منصوبہ 2007 میں شروع کیا گیا جو اس سال 2015 میں مکمل ہوگا۔ یہ منصوبہ بھی لگ بھگ یو ایس ایڈ کے ڈیری پروجیکٹ جیسا ہی ہے جس کے بنیادی مقاصد درج ذیل ہیں۔

پہلا مرحلہ:

- **چھوٹے کسانوں کو تعلیم و تربیت کے زریعے معاشی طور پر آگہی فراہم کرنا۔**

منصوبے کے تحت مال مویشی پالنے والے چھوٹے کسانوں کے ساتھ باقائدگی کے ساتھ اجلاس منعقد کیے جاتے تھے جس میں مال مویشی پالنے کے منافع بخش جدید طریقوں سے روشناس کرایا جاتا تھا۔

- **تعلیم و تربیت کے زریعے ان کی صلاحیتوں میں اضافہ کرنا۔**

کسانوں کو جانوروں کی دیکھ بھال کے انتظامی امور، باڑے کی تعمیر، بچھڑوں کی بہتر پرورش کے اصول، جانوروں کی صحت، خوراک اور افزائش نسل کے اصول اور چارے کو محفوظ کرنے کے طریقوں پر چارٹس کے زریعے تربیت فراہم کی جاتی تھی اور کسانوں کی دلچسپی بڑھانے کے لیے انہیں جدید فارموں کے دورے بھی کرائے گئے تھے۔

- **پاکستانی سائنسدانوں کی ڈیری کے شعبے میں تحقیقی صلاحیتوں کو مزید اجاگر کرنا۔**

پاکستانی اور آسٹریلیوی سائنسدانوں کے درمیان روابط اور عملی تعاون کے نتیجے میں زرعی یونیورسٹی فیصل آباد کے اشتراک سے ساہیوال نسل کے بچھڑوں پر تحقیقاتی منصوبہ چلایا گیا جس کا مقصد پیدائش سے دودھ چھڑانے تک کے مرحلے میں بڑھوتری کے عمل کا جائزہ لینا اور کسانوں کو جدید اور سستا طریقہ پرورش سے متعارف کرانا تھا۔

اس پروگرام میں دیگر توسیعی پروگراموں کے علاوہ قومی اور صوبائی تحقیقاتی اداروں،محکمہ مال مویشی اور قومی منصوبہ برائے دیہی ترقی (نیشنل رورل سپورٹ پروگرام) کے بہترین ملازمین کا انتخاب کرکے انہیں مختلف موضوعات پر عملی تربیت دی گئی تھی تاکہ وہ کسانوں کو بہتر اور منظم طریقے سے تربیت دیں اور اس پر عمل درآمد کرواسکیں۔

دوسرا مرحلہ:

- پہلے مرحلے کے کامیاب منصوبوں کے نتائج کو موثر انداز میں پاکستان کے دوسرے اضلاع تک پہنچانا۔
- چھوٹے پیانے پر مال مویشی پالنے والے کسانوں کو آسان اور جدید طریقوں سے اپنے جانوروں کی خوراک کے موجودہ وسائل کے بہترین استعمال کی تربیت دینا۔
- دودھ دینے والے جانوروں کے بچھڑوں کو پالنے کے جدید اور منافع بخش طریقے متعارف کرانا۔
- دودھ کی پیداوار میں اضافے کے ساتھ ساتھ فروخت کے مزید منافع بخش طریقے متعارف کرانا جیسے بچھڑوں کو بوتل سے دودھ کی متعین کی گئی مقدار دینا، ونڈا اور دیگر

وزن بڑھانے والی خوراک کا استعمال۔

- دودھ کی پیداوار سے فروخت تک کے عمل سے وابستہ افراد کو تربیت فراہم کرنا۔ تاکہ وہ تجارتی طور پر بنائے گئے بڑے باڑوں (کارپوریٹ فارمز) کو بہتر طریقے سے چلا سکیں۔

اب تک ہم نے مال مویشیوں سے جڑے دیگر شعبہ جات کے علاوہ اس شعبے میں فراہم کردہ تربیتی پروگراموں کا ایک جائزہ پیش کیا ہے۔ اگلے سیکشن میں مال مویشیوں سے حاصل کردہ دودھ سے جڑی کمپنیوں پر ایک نظر ڈالی جارہی ہے۔

ڈبہ بند (ٹیٹرا پیک) دودھ فروخت کرنے والی کمپنیاں

دودھ فروخت کرنے والی بڑی کمپنیوں میں نیسلے، اینگروفوڈز پرائیوٹ لمیٹڈ شامل ہیں جن میں نیسلے اپنے حجم اور فروخت کے اعتبار سے قابل ذکر ہے۔ نیسلے پاکستان میں دودھ اور گوشت کی پیداوار میں اضافے کے لیے جاری یو ایس ایڈ کے ''ڈیری پروجیکٹ'' کی اہم شراکت دار ہے جس کے پاس بڑے پیمانے پر دودھ کو اکٹھا کرنے اور اسے پیک کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔ پنجاب کے علاقے کبیر والا میں 16 مارچ 2007 کو جنرل پرویز مشرف اور چیف ایگزیکٹو آفیسر نیسلے برا بیک لیٹ میتھ (Brabeck-Letmath) نے دنیا کے سب سے بڑے دودھ اکٹھا اور تیار (پراسیس) کرنے کے پلانٹ کا افتتاح کیا جس کی یومیہ دوملین لیٹر دودھ تیار کرنے کی صلاحیت ہے جو آنے والے سالوں میں تین ملین لیٹر یومیہ ہوجانی تھی۔[17] کمپنی 190,000 کسانوں سے دودھ اکٹھا کرتی ہے۔[18] اس کے علاوہ اولپرز دودھ اور دودھ سے بنی دیگر مصنوعات بنانے والی کمپنی اینگروفوڈز کا اپنا باڑا ہے جس میں 4,000 آسٹریلین گائے ہیں جن کا دودھ کمپنی خود دیگر مراحل (پراسس) سے گزار کر پیک کرتی ہے۔[19]

دودھ پیک کرنے والی کمپنیاں کسانوں سے دیہات کی سطح پر اپنے دودھ خریدنے کے مراکز پر معیار کے اعتبار سے 35 سے 40 روپے فی کلو دودھ خریدتی ہیں جو 110 روپے فی لیٹر فروخت ہورہا ہے جبکہ کھلا دودھ فروخت کرنے والے دکاندار یا دودھ کے ترسیل کنندہ کسانوں سے دودھ 60 سے 70 روپے فی کلو خریدتے ہیں جو دکانوں پر 80 سے 100 روپے فی کلو فروخت ہوتا ہے۔☆ کسانوں سے دیہات کی سطح پر خریدے جانے والے دودھ کو الٹرا ہائی ٹیمپریچر (UHT) یعنی ایک خاص درجہ حرارت پر مخصوص مدت تک گرم کیا جاتا ہے جس سے اس میں موجود جراثیم مرجاتے ہیں۔ اس کے بعد دودھ کو خصوصی طور پر تیار کردہ ڈبوں میں پیک کردیا جاتا ہے جس سے دودھ میں جراثیم داخل نہیں ہوتے اور دودھ عام درجہ حرارت پر بھی کئی دنوں یا ہفتوں تک خراب نہیں ہوتا۔ ان کمپنیوں کے ڈبہ بند دودھ اور اس سے تیار شدہ دیگر مصنوعات کے کچھ برانڈز بہت مقبول ہیں جن کی فہرست اور قیمت درج ذیل ہے۔[20]

نیسلے: ملک پیک ایک لیٹر: 110 روپے۔

نیسلے: ملک پیک کریم 200 ملی لیٹر: 75 روپے۔

نیسلے: نیسویٹا ایک لیٹر: 140 روپے۔

نیسلے: مائلو ذائقہ دار دودھ 200 ملی لیٹر: 40 روپے۔

اینگروفوڈز: ترنگ آدھا لیٹر: 40 روپے۔

اینگروفوڈز: ڈیری امنگ ایک لیٹر: 85 روپے۔

اینگروفوڈز: اولپرز دودھ ایک لیٹر: 110 روپے۔

تبصرہ

پاکستان میں مال مویشی شعبے میں جاری اصلاحات، امدادی اداروں کے منصوبوں اور اس شعبے سے جڑے دیگر عوامل پر ایک تنقیدی تبصرہ درج ذیل ہے۔

مویشی پالنے والے کسان

پاکستان میں مویشی پالنے والے 80 فیصد کسان ایسے ہیں جن کے پاس مویشیوں کی تعداد ایک سے پانچ تک ہے۔ ان بے زمین اور چھوٹے کسانوں کے لیے مویشی پالنا کوئی منافع بخش تجارت نہیں بلکہ غذائی اور سماجی تحفظ ہے جو سیلاب جیسی آفات اور برے وقت میں کسانوں کے لئے خوراک فراہم کرنے کا ذریعہ بنتے ہیں اور نقد اثاثے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ کسان عموماً کھیتوں میں مزدوری کرتے ہیں یا ٹھیکے پر زمین حاصل کرکے اپنی غذائی ضروریات کے لیے فصلیں اور ساتھ ہی مویشیوں کے لیے کچھ چارہ کاشت کرتے ہیں جبکہ کسان مزدور مویشیوں کے لیے چارہ عموماً کھیتوں میں مزدوری کے عوض حاصل کرتے ہیں۔

پاکستان میں مال مویشی شعبے میں جاری اصلاحات اور غیر ملکی امدادی اداروں کے منصوبوں میں نہایت کسمپرسی کے شکار طبقے سے نا صرف اسکا غذائی تحفظ بلکہ اس کا روزگار بھی چھین لینے کا مقصد واضح نظر آتا ہے۔ ایک طرف چھوٹے اور مال مویشی پالنے والے طبقے سے مقامی مال مویشیوں کی نسلوں کو جدید خطوط پر استوار کرنے کے نام پر چھینا جارہا ہے دوسری طرف انہیں نہایت مہنگے چارے کی منڈی کا محتاج بنایا جارہا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ مال مویشیوں سے حاصل کردہ گوبر سے بھی ایک اہم ترین اور پیداواری جنس بائیو گیس حاصل کی جارہی ہے۔ جس طرح چھوٹے کسانوں اور کھیت مزدوروں کو یہ علم ہی نہیں کہ وہ گنا نہیں اگا رہے بلکہ غیر ملکی منڈی کے لیے ایتھنول پیدا کررہے ہیں جو ایک متبادل توانائی ہے۔ اس ہی طرح مال مویشی پالنے والے پیداواری طبقے کو یہ معلوم نہیں کہ وہ نا صرف بڑی بڑی کمپنیوں کے لیے دودھ، بالائی، خشک دودھ اور دیگر اشیاء پیدا کررہے ہیں بلکہ بائیو گیس بھی پیدا کرکے دے رہے ہیں۔

(بقیہ صفحہ 32 پر دیکھیں)

Set 8 (Back)

بیج کا قانون: کمپنیوں کا غلبہ، کسان کی بربادی!

مجوزہ پاکستانی سیڈ ایکٹ 2014

- کسان کے بیج کے حق پر ڈاکہ۔
- بین الاقوامی کمپنیوں کے قبضہ کا محافظ۔
- بین الاقوامی کمپنیوں کو بیج بنانے، اگانے اور فروخت کا مکمل اختیار۔
- کسان کمپنیوں کا محتاج۔
- کسان کے لیے مہنگے ترین بیج۔
- کیمیائی زراعت اور جینیاتی فصلوں کا فروغ۔
- بھوک، قحط، موسمی تباہی اور ماحولیاتی آلودگی۔

کسانوں کے حقوق

- بیج کسان کی لاکھوں سال کی جستجو اور محنت کا ثمر۔
- بیج کسانوں کی اجتماعی ملکیت۔
- بیج کسان کی بقاء اور پہچان۔
- بیج کسان کے روزگار کا اہم ترین وسیلہ۔
- بیج حیاتیاتی تنوع کی بقاء۔
- بیج خوراک کی خودمختاری۔

کمپنیوں کا شکنجہ / اجارہ داری

- کمپنیاں منافع خوری کے اصول پر کاربند۔
- منافع خوری خوراک کی خودمختاری میں بڑی رکاوٹ۔
- ڈبلیو ٹی او کا انسان وکسان دشمن ٹرپس معاہدہ کمپنیوں کی سازش۔
- مجوزہ پاکستان سیڈ ایکٹ ٹرپس کا عملی نمونہ۔
- کمپنیوں کے بے حساب منافع کا ذریعہ۔
- کمپنیوں کے لیے خوراک اور زراعت پر قبضے کی راہ ہموار۔

(بقیہ مال مویشی شعبے پر بین الاقوامی کمپنیوں کا قبضہ)

خشک دودھ کی درآمد

پاکستان میں ڈیری پروجیکٹ کے تحت دودھ کی پیداوار میں اضافہ کرنے کی دعویدار خود نیسلے ملک میں خشک دودھ کی بڑی درآمد کنندہ ہے جس نے 2014 میں 10 بلین روپے کا خشک دودھ درآمد کیا جبکہ 2013 میں مجموعی طور پر 22 ملین کلوگرام خشک دودھ درآمد کیا گیا۔ خشک دودھ کی درآمد کے یہ اعداد و شمار اس امکان کو تقویت دیتے ہیں کہ ٹیٹرا پیک دودھ فروخت کرنے والی کمپنیاں خشک دودھ کو تازہ دودھ کے متبادل کے طور پر استعمال کررہی ہیں جس سے ملک میں دودھ کی برآمد میں اضافہ ہورہا ہے۔ عالمی منڈی میں خشک دودھ کی قیمتیں کم ہورہی ہیں اور چونکہ ٹیٹرا پیک دودھ فروخت کرنے والی کمپنیاں خشک دودھ استعمال کررہی ہیں اسی لیے 31 مارچ 2015 کو ختم ہونے والی سہ ماہی میں صرف اینگروفوڈز نے 1.068 بلین روپے کا منافع کمایا جو گزشتہ سال اسی عرصے میں صرف 190.07 ملین روپے تھا۔ کمپنی کے منافع میں اضافے کی بنیادی وجہ کمپنی کا تیار کردہ ٹیٹرا پیک دودھ اولپرز کی فروخت میں اضافہ ہے۔ کمپنی کے منافع میں ہونے والا یہ اضافہ 462 فیصد ہے۔[21]

مال مویشی شعبے میں ہونے والی برآمدات کی مالیت تو اکنامک سروے آف پاکستان نے اپنی رپورٹ میں شائع کی ہے لیکن درآمدات کا صرف حجم بیان کیا گیا جبکہ اسٹیٹ بینک کی جانب سے درآمدی مالیت تو ظاہر کی گئی ہے لیکن مجموعی طور پر جس میں ڈیری، گوشت وغیرہ ایک ساتھ ظاہر کیے گئے ہیں۔

ٹیٹرا پیک دودھ فروخت کرنے والی کمپنیاں

پراسس کردہ ٹیٹرا پیک میں محفوظ دودھ کی قیمت منڈی میں دستیاب کھلے دودھ کی قیمت سے کم از کم دس فیصد زیادہ ہے اور اسی تناسب سے دیگر مصنوعات مثلاً دہی، ذائقہ دار دودھ وغیرہ کی قیمت بھی زیادہ ہے۔ یہ کمپنیاں کسانوں سے انتہائی کم قیمت پر دودھ خرید کر صارفین کو کھلے دودھ کے مقابلے مزید دس فیصد مہنگا فروخت کرکے دونوں کا استحصال کررہی ہیں۔ یہی وجہ ان کمپنیوں کے منافع میں سینکڑوں فیصد اضافے کی بھی ہے۔ خیال رہے کہ یہ دودھ نا صرف مہنگا ہے بلکہ صحت کے اعتبار سے مضر بھی ہوسکتا ہے کیونکہ ایک تو یہ تازہ دودھ نہیں دوسرا یہ کہ اس میں ایسے کیمیائی اجزاء شامل کیے جاتے ہیں جو دودھ کو مخصوص مدت تک خراب ہونے سے روکتے ہیں۔[22] ایک تحقیق کے مطابق نیسلے ملک پیک، اولپرز اور پانچ دیگر ٹیٹرا پیک ڈبوں میں کئی کیمیائی اجزاء جن میں فارملن (formalin) بھی شامل ہے پائے گئے ہیں۔ فارملن کے کئی نقصانات واضح کیے گئے ہیں جن میں سب سے زیادہ تشویشناک اس کا کینسر کا مرض پیدا کرنا ہے۔[23]

کسان غیرملکی کمپنیوں سے مادہ منویہ، ادویات، مویشیوں کی خوراک پر جو اخراجات ادا کرتے ہیں وہ پیداوار فروخت کرکے بھی حاصل نہیں کرپاتے اور نہ ہی ان کی پیداوار کو تحفظ حاصل ہے۔ اگر دودھ پیک کرنے والی کمپنیاں درآمد شدہ خشک دودھ کو ہی تیار (پراسیس) کرکے ٹیٹر پیک میں فروخت کرہی ہیں تو ایسی صورت میں ان کسانوں کی پیداوار کی منڈی میں قیمت مزید کم ہوسکتی ہے۔ دودھ کی پیداوری لاگت میں اضافے اور قیمت میں کمی کی جاری صورتحال میں کسان احتجاج کرنے پر مجبور ہوگئے ہیں جس کا مظاہرہ حال ہی میں اسلام آباد میں کسانوں نے کیا۔ کسانوں نے دودھ کی کم قیمت اور خشک دودھ کی درآمد پر بھاری محصول عائد کرنے کا مطالبہ کیا اور احتجاجاً سینکڑوں لیٹر دودھ سڑکوں پر بہا دیا۔[24]

غیرملکی امدادی اداروں کے ترقیاتی منصوبے

پاکستان میں جاری غیرملکی امدادی اداروں کے منصوبے بظاہر ملک میں مال مویشیوں کے شعبے میں ترقی اور پیداوار میں اضافے کے لیے کام کررہے ہیں جس کا مقصد کسانوں کی آمدنی میں اضافہ ہے۔ لیکن اگر ان امدادی اداروں کی جانب سے مال مویشی کے شعبے میں کئے گئے اقدامات کا باریک بینی سے جائزہ لیں تو واضح ہوتا ہے کہ ان منصوبوں سے پاکستان میں کسانوں کی آمدنی میں تو کوئی خاطر خواہ اضافہ نہیں ہوا البتہ امداد دینے والی ممالک کی بیج، مویشیوں کی خوراک، مادہ منویہ، ٹیٹرا پیک اور خشک دودھ فروخت کرنے والی ملٹی نیشنل کمپنیوں کے کاروبار میں کئی گنا اضافہ ہوا۔ ان منصوبوں کے زریعے یہ کمپنیاں مقامی منڈی پر قبضہ کرنا چاہتی ہیں۔

ملک میں صرف گائے اور بھینسوں کی تعداد ہی 76.8 ملین ہے یعنی پاکستان نہ صرف چارہ، ادویات، زندہ مویشی، مادہ منویہ کی فروخت کے لیے ایک بہت بڑی منڈی ہے بلکہ پاکستان دودھ استعمال کرنے والوں کی بھی ایک بڑی منڈی ہے جہاں پراسس دودھ فروخت کرنے والی کمپنیاں بے تحاشہ منافع کمارہی۔ اگلی سطور میں جاری ان منصوبوں کی ترجیحات پر ایک تنقیدی نظر ڈالتے ہیں۔

مویشیوں کے باڑوں کو جدید بنانا

پاکستان جیسے ترقی پزیر ممالک میں ترقی یافتہ سرمایہ دار ممالک اور ان کی کمپنیاں جدید سائنسی ٹیکنالوجی اور تحقیق کو اپنا ہتھیار بناتی ہیں جس کے بل پر سب سے پہلے روایتی اور پائیدار طریقوں کو فرسودہ قرار دے کر جدید طریقوں کو اپنانے پر مجبور کرتی ہیں جس سے براہ راست ان ممالک کی کمپنیوں کے کاروبار میں اضافہ ہوتا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے پورا شعبہ ان کمپنیوں کی تیار کردہ ادویات، کھاد، بیج جیسے مداخل کا محتاج ہوجاتا ہے۔

مال مویشی شعبے میں مویشیوں کے باڑوں کو جدید بنانا اس سلسلے کی پہلی کڑی ہے جس میں مویشی پالنے کے روایتی طریقوں کو رد کرکے ان کے لیے ایک ایسا باڑہ قائم کرنا جہاں مویشیوں سے حاصل ہونے والی پیداوار کا حساب کتاب، مویشیوں کی خوراک کے لیے سائیلج کا بندوبست، توانائی کے حصول کے لیے بائیو گیس پلانٹ کی تنصیب، دودھ ٹھنڈا کرنے کی سہولت، بچھڑوں کو ماں سے علیحدہ رکھنے کا مناسب بندوبست تاکہ انہیں ماں کا دودھ پینے سے روکا جاسکے، صفائی ستھرائی کا بندوبست تاکہ دودھ خریدنے والی کمپنیوں کا مطلوبہ معیار حاصل کیا جاسکے۔

ونڈہ اور دیگر درآمدی خوراک

پاکستان میں مکئی کے بیجوں کی درآمد صرف تین سالوں میں (2010-13) 19.26 ملین ڈالرز سے 61.10 ملین ڈالرز ہوگئی۔[25] امریکی اور آسٹریلوی ڈیری پروجیکٹ میں کسانوں کی تربیت میں پیداوار میں اضافے کے لیے جس عمل پر سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے وہ روایتی چارے کے بجائے ونڈہ کا استعمال ہے۔

پاکستان میں مکئی کی فصل کا بطور غذا گندم کی طرح استعمال عام نہیں ہے اس کے باوجود مکئی کے زیرکاشت رقبے میں سال 2013-14 میں 5.4 فیصد اضافہ ہوا جس سے پیداوار 4.527 ملین ٹن تک چلی گئی[26] اس کا مطلب ہے کہ دیگر غذائی فصلوں کے زیر کاشت رقبے میں کمی واقع ہورہی ہے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ مویشیوں کی غذائی ضروریات گندم اور چاول کی فصلوں سے بھی پوری کی جاسکتی ہے جس سے بھوسہ (توڑی) حاصل ہوتا ہے اور مویشی رغبت سے کھاتے ہیں۔ پاکستان میں جاری یو ایس ایڈ کا امدادی منصوبہ مکئی سائیلج بنانے کے لیے جن مخصوص بیجوں کی کاشت کی ترغیب دے رہا ہے وہ زیادہ تر امریکی بیج کمپنی پائینیر کے ہیں[27] جس کا واضح مقصد پاکستان میں کمپنی کے کاروبار اور منافع میں اضافے اور جینیاتی مکئی متعارف کرنے کی منصوبہ بندی نظر آتی ہے جس کے لیے سیڈ ایکٹ 2015 پہلے ہی ان غیرملکی بیج کمپنیوں کے دباؤ پر منظور کیا جاچکا ہے۔

کسانوں کو مویشیوں کو کھل کھلانے سے منع کیا جاتا ہے کہ کپاس کی فصل پر زہر چھڑکا جاتا ہے جس کے اثرات کھل میں بھی پائے جاتے ہیں دوسری طرف کسانوں کو ونڈے اور دیگر چارہ جات میں چار فیصد یوریا شامل کرنے کی تجویز دی جارہی ہے حالانکہ ساتھ یہ تاکید بھی کی جاتی ہے کہ یوریا کی زیادتی فوری طور پر مویشی کی ہلاکت کی وجہ بن سکتی ہے۔ پاکستان میں جہاں کسان پڑھنا لکھنا نہیں جانتے کس طرح درست تناسب کی پیمائش کرسکتے ہیں۔ یوریا کی بطور خوراک دیگر نقصانات سے قطع نظر یہی ایک وجہ کسانوں کو شدید مالی نقصان سے دوچار کرسکتی ہے۔

امریکی اور آسٹریلوی امداد سے چلنے والے دونوں منصوبوں میں کسانوں کو دودھ اور گوشت کی پیداوار میں اضافے کے لیے اور مویشیوں کے بچھڑوں کے لیے دودھ کی متبادل غیرملکی خوراک تجویز کی جارہی ہیں۔ پاکستان میں میکسم انٹرنیشنل امریکی کمپنی کی تیار کردہ خوراک کی تقسیم کار ہے جو امریکی کمپنی تھرو نیوٹریشن (Trouw Nutrition) اور دیگر کمپنیوں کی غیرملکی خوراک فروخت کرتی ہے۔[28] امدادی منصوبوں کے زریعے پاکستان میں ان مصنوعات کی فروخت میں اضافہ کیا جارہا جس سے ان امریکی اور دیگر ممالک کی کمپنیوں کے منافع میں بھی اضافہ ہورہا ہے۔ ان کمپنیوں کی خوراک کے استعمال سے کسان کے لیے یومیہ بنیاد پر 150 سے 200 روپے فی مویشی پیداواری لاگت میں اضافہ ہوجاتا ہے جبکہ آسٹریلیا کے ڈیری پروجیکٹ میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ اس کے تربیتی پروگرام سے کسانوں نے فی مویشی یومیہ 1.5 کلو دودھ کی اضافی پیداوار حاصل کی جس کی قیمت کھلی منڈی میں 100 روپے سے زیادہ نہیں یعنی لاگت میں یومیہ اضافہ 150 روپے جبکہ منافع میں اضافہ بھی لگ بھگ 150 روپے۔

کسانوں کو پیداوار میں اضافے کے لیے تجویز کردہ خوراک مہنگی تو ہے ہی اس کے مضر اثرات بھی ہیں۔ اس بارے میں کسانوں کا کہنا ہے کہ ونڈہ کھانے والے مویشی کے دودھ کا رنگ نیلا مائل ہوجاتا ہے اور اس میں ناگوار بو آتی ہے۔ دودھ سے حاصل ہونے والے مکھن میں بھی یہ اثرات پائے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ ونڈہ کے استعمال سے مویشیوں کی تولیدی صحت پر بھی منفی اثرات پڑتے ہیں۔

افزائش نسل

پاکستان جینیاتی وسائل سے مالا مال ملک ہے جس کی مویشیوں کی کئی اقسام پیداوار کے لیے مشہور ہیں جن میں ساہیوال نسل، داجل، نیلی راوی، کنڈی، چولستانی اور سرخ سندھی شامل ہیں اس کے باوجود بین الاقوامی امدادی اداروں کے ڈیری پروجیکٹ میں کسانوں کو افزائش نسل کے لیے غیرملکی نسل کا مادہ منویہ استعمال کرنے کی ترغیب دی جارہی ہے۔

مویشیوں کی خوراک فروخت کرنے والی کمپنی میکسم انٹرنیشنل پاکستان میں مادہ منویہ فروخت کرنے والی امریکی کمپنی ورلڈ وائڈ سائیرز (World Wide Sires) کی بھی تقسیم کار ہے۔[29] غیرملکی نسل کے مادہ منویہ کی فروخت میں اضافہ پاکستان میں امریکی کمپنی کے کاروبار اور منافع میں اضافے کا سبب بنے گا اور ساتھ ہی کسانوں کے پیداواری اخراجات میں اضافے کا بھی کیونکہ جیسا کہ پہلے بتایا گیا کہ غیرملکی کمپنیوں کی مادہ منویہ کی خوراک پانچ ہزار سے سات ہزار روپے کی ہے جو مقامی مادہ منویہ کی خوراک کی قیمت پانچ سو سے ایک ہزار روپے کے مقابلے کئی گنا مہنگی ہے۔

آسٹریلوی امدادی ادارے میں شامل پاکستان کی اعلیٰ ساہیوال نسل کے بچھڑوں پر جاری تحقیقی منصوبہ اور امریکی امدادی ادارے کے منصوبے میں غیرملکی نسل کے مادہ منویہ کا فروغ اس خطے میں ہزاروں سال سے چلے آرہے مقامی جینیاتی وسائل ختم کرنے کی سازش ہے جس کا مقصد یہاں کے کسانوں کو سرمایہ دار ممالک کی

جینیاتی وسائل فروخت کرنے والی کمپنیوں کا محتاج بنانا ہے۔ سرمایہ دار ممالک اور ان کی کمپنیاں امدادی منصوبوں کی آڑ میں پاکستان میں مویشی پالنے والے کسانوں سے ان کا یہ قیمتی اثاثہ چھین کر اپنے لیے منافع کمانے کی راہ ہموار کررہی ہیں بلکل اس ہی طرح جس طرح کسانوں کو جدت اور زیادہ پیداوار کا جھانسہ دے کر صدیوں سے چلے آرہے روایتی بیجوں سے محروم کردیا گیا۔حکومتی زرعی پالیسوں کے تحت ملک میں جاری یہ منصوبے کسانوں کسانوں کو بے روزگاری، غربت اور غذائی عدم تحفظ میں دھکیلنے کے مترادف ہیں۔

یو ایس ایڈ کے ڈیری پروجیکٹ کے تحت دیہی نوجوانوں کو تربیت بھی ان کمپنیوں کے کاروباری مفاد میں دی گئی۔ یہ نوجوان گاؤں گاؤں جاکر ان کمپنیوں کے کاروبار میں اضافہ کررہے ہیں۔ ملک میں جاری بیروزگاری اور غربت کا فائدہ اٹھا کر یہ کمپنیاں نوجوان نسل کو منڈی میں غیرملکی اشیاء فروخت کرنے کے لیے استعمال کرہی ہیں بجائے اس کے کہ یہ نوجوان ملکی زرعی شعبے میں زیرکاشت رقبے میں اضافے، مال مویشی شعبے میں ترقی کا باعث بنتے اور ملکی پیداواری عمل میں اپنا حصہ ڈالتے غیرملکی کمپنیوں کے سیلز مین (اشیاء فروخت کرنے والے) بن کر رہ گئے ہیں۔ یہ عمل دیہات میں رہنے والی نوجوان نسل کو زراعت سے دور کرکے ان کی صلاحیتوں کو ضائع کرنے کے مترادف ہوگا۔

بائیوگیس پلانٹ اور سائیلج

پاکستان میں دیہات میں بائیوگیس پلانٹ کی تنصیب کو سمجھنے کے لیے اس سے متعلق کچھ معلومات یہاں بیان کرنا ضروری ہیں۔ دنیا بھر میں اس وقت سبز معیشت پر مبنی ماحول دوست ایندھن کے استعمال پر زور دیا جارہا ہے کیونکہ رکازی ایندھن (فوسل فیول) کے استعمال سے فضا میں کاربن کا اخراج ہوتا ہے جس کی وجہ سے عالمی درجہ حرارت میں اضافہ اور اس کے نتیجے میں موسمی تبدیلیاں رونما ہورہی ہیں جو دنیا بھر میں موسمی شدت میں اضافے کا سبب ہیں۔ تیل کی تباہ کاریوں اور اس کی قیمتوں میں اضافے کے پیش نظر سرمایہ دار ممالک اور ان کی کمپنیاں اب سبز معیشت کو فروغ دی رہی ہیں۔

سائنسی نقطہ نگاہ سے بائیوگیس پلانٹ اور سائیلج، توانائی کی موثر پیداوار کے لیے ضروری ہیں۔ یورپ اور خصوصاً جرمنی میں متبادل توانائی کے لیے یہ ٹیکنالوجی بڑی تیزی سے فروغ پارہی ہے جسے کو ڈائیجیشن (co-digestion) کہتے ہیں۔ یعنی مویشیوں سے حاصل ہونے والے گوبر اور سائیلج میں تیار کردہ مکئی دونوں کو بائیوگیس پلانٹ میں استعمال کیا جاتا ہے۔ اس ٹیکنالوجی کے تیزی سے پھیلنے کی وجہ یہ ہے کہ ان دو اجزاء کے باہمی عمل سے گیس کی پیداواری صلاحیت میں کئی گنا اضافہ ہوجاتا ہے۔[30]

اس طرح پاکستان کیونکہ مویشیوں کی ایک بڑی تعداد رکھتا ہے تو اس سے حاصل ہونے وال گوبر اور دستیاب مکئی کی فصل بڑے پیمانے پر توانائی کے حصول کے لیے استعمال ہوسکتی ہے۔ یہ بات قابل غور ہے کہ پاکستان میں کسانوں کو بائیوگیس پلانٹ اور سائیلج بنانے کے لیے مفت تربیت فراہم کی جارہی ہے اور اس تربیت میں انہیں مخصوص قسم کے مکئی کے بیج کاشت کرنے کی ترغیب دی جارہی ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ مکئی کی پیداوار حاصل کی جاسکے۔ ملک بھر کے کسانوں کو دودھ کی پیداوار میں اضافے کے نام پر مویشیوں کو مخصوص مکئی سے تیار شدہ ونڈہ کھلانے کی ترغیب دراصل مکئی کی پیداوار میں اضافے کا منصوبہ ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ مکئی کی پیداوار حاصل کرکے بائیو فیول کی بین الاقوامی طلب پوری کرنے کے لیے پاکستان سے مکئی برآمد کی جائے۔مکئی کی کاشت اور اس کی برآمد کے رجحان کا اندازہ 13-2012 کی پیداوار سے لگایا جاسکتا ہے جس میں گزشتہ سال کے مقابلے سات فیصد اضافے سے 4.63 ملین ٹن پیداوار ہوئی۔[31]

مویشیوں کی تعداد اور دستیاب مکئی کی فصل بڑے پیمانے پر توانائی کے حصول کے لیے استعمال ہوسکتی ہے۔ ملک میں جاری توانائی کے بحران میں اس طرح کی کوششیں ملک میں دیگر غذائی فصلوں کے زیر کاشت رقبے اور پیداوار میں کمی کے ساتھ مکئی کی برآمد میں اضافے کا سبب بن سکتی ہیں جس کا سراسر فائدہ مکئی درآمد کرنے والے ان ممالک کو ہوگا جو مکئی کو متبادل ایندھن کے طور پر استعمال کررہے ہیں۔

یورپی ممالک میں یہ رجحان جاری ہے کہ کسان زرعی زمینوں پر صرف مکئی اگا کر سائیلج بنا کر بائیوگیس سے چلنے والے بجلی گھروں کو ایندھن فراہم کررہے ہیں۔ یہ خارج ازامکان نہیں کہ یہ امدادی ادارے پاکستان میں کسانوں کو منافع کا لالچ دے کر اہم غذائی فصلوں کے بجائے ایندھن کے لیے استعمال ہونے والی فصلیں کاشت کرواکر ملک میں توانائی کے حصول کے لیے بائیوگیس سے چلنے والے بجلی گھر بنانے کی منصوبہ بندی کررہے ہوں۔ ایسی صورتحال میں ملک میں دیگر غذائی فصلوں کے زیرکاشت رقبے میں زبردست کمی آسکتی ہے جس سے پاکستان جو چاول اور گندم کی پیداوار میں خودکفیل ہے خوراک کے معاملے میں محتاج بن سکتا ہے۔ یہ خیال رہے کہ پاکستان میں گنے کی کاشت پہلے ہی بڑے پیمانے پر بڑھ چکی ہے جس کے زریعے بھی ایتھنول حاصل کیا جارہا ہے۔[32]

اوپر ذکر کیے گئے امکانات کو ان حقائق سے تقویت ملتی ہے کہ ملک میں بڑے پیمانے پر زرعی زمینوں کی بندربانٹ جاری ہے۔حکومت کارپوریٹ فارمنگ کے لیے بڑے بڑے زمینی رقبے ملکی اور غیرملکی سرمایہ کاروں کو الاٹ کررہی ہے۔ بجائے اس کے کہ یہ زمین ان کسانوں میں تقسیم کردی جائے جنہیں اپنے مویشیوں کی غذائی ضرویات کے لیے چارہ دستیاب نہیں جس کی وجہ سے مویشوں سے حاصل ہونے والی پیداوار کم ہے۔کسان کے پاس زمین کا ہونا ناصرف خود اسکی بدحالی کا سبب ہے بلکہ مجموعی طور پر پوری قوم کے غذائی تحفظ کے لیے خطرہ ہے۔

ترمیمی سیڈ ایکٹ 2015 کی منظوری نے بیج کمپنیوں کو ملک میں درآمدی بیج فروخت کرنے کی نہ صرف چھوٹ دی بلکہ کسانوں سے ان کے بیج کا حق بھی چھین لیا۔ آج کسان ان مداخل جنہیں زیادہ پیداوار کے نام پر فرسودہ اور غیر سائنسی قرار دے کر مسترد کردیا گیا، کی جگہ یوریا اور ڈی اے پی جیسے زیادہ پیداوار والے مداخل استعمال کرتا ہے جس سے پیداوار میں وقتی طور کچھ اضافہ تو ہوجاتا ہے پر کسان ان مداخل پر آنے والی لاگت پوری نہیں کر پاتا اور قرضوں کے بوجھ تلے دب کر رہ جاتا ہے۔ دوسری طرف ان کیمیائی مداخل کے زہر سے حیاتیاتی تنوع تباہ ہورہی ہیں۔

یہی طریقہ مال مویشیوں کے شعبے میں استعمال کیا جارہا ہے۔ اب کسان چارے کے لیے بھی بیج خریدتا ہے، پہلے یوریا صرف کھیتوں میں استعمال کررہا تھا اب مویشیوں کی خوراک کے طور پر بھی استعمال کرتا ہے، پہلے افزائش نسل کے لیے مقامی وسائل استعمال کرتا تھا اب ہزاروں روپے خرچ کرتا ہے، پہلے ہر انسانی غذائی فصل مویشیوں کی خوراک کے لئے بھی موزوں تھی اب وہ صرف ونڈہ جیسی خوراک ہی کھاسکتے ہیں۔ کسان اگر یہ سب طریقے نہ اپنائے تو پیداوار میں کمی کی صورت نقصان اٹھاتا ہے اور اگر اپنائے تو پیداواری لاگت میں اضافے کی صورت نقصان اٹھاتا ہے کیونکہ منڈی میں اس کی پیداوار کی قیمت انتہائی کم ہے۔

اخلاقی طور پر قدرت کے طریقہ کار پر ایک اور کاری ضرب بچھڑے کو ماں کے دودھ سے ہٹا کر لگائی جارہی ہے۔ کل حیات آپس میں گھمبیر کڑی کے طور پر جڑی ہوئی ہے۔ مویشیوں کی صحت مند غذا ہی کل انسانیت کے لیے صحت مند غذا کی ضامن ہے۔ مویشیوں کو مصنوعی غذا دینے کا مطلب ہے کہ اس کا اثر یقیناً ماحولیات اور انسان پر بھی ہوگا۔ اس کے علاوہ یہ بھی ایک اہم نقطہ ہے کہ حیوانات اور دیگر حیات صرف پیداوار کے لیے نہیں ہے بلکہ قدرت میں لاکھوں دیگر خدمات بھی انجام دیتی ہیں جو حیاتیاتی تنوع کی بقا لیے لازم ہے۔ اگر ہمارا کوئی مال مویشی زیادہ دودھ نہیں دیتا تو ہمیں اس کی طرف سے کوئی اور انمول تحفہ حاصل ہے جیسے کہ راجن پور کی داجل گائے کا دودھ نہایت میٹھا اور گوشت ذائقہ دار ہوتا ہے۔

مال مویشیوں کے شعبے میں جاری اصلاحات پاکستان میں سرمایہ دار ممالک کی نیولبرل یا آزاد تجارت پر مبنی پالیسیوں کے نفاذ کا منصوبہ ہے جس میں پیداوار میں اضافہ کسانوں کی غربت دور کرنے اور انہیں خوشحال بنانے کے لیے نہیں بلکہ انہیں منڈی کا محتاج بنا کر ملکی پیداوار بین الاقوامی منڈی تک لے جانے اور منافع سمیٹنے کے لیے کیا جارہا ہے۔ ملکی سیاست اور حکومت پر قابض جاگیر دار اور سرمایہ دار طبقہ اس منصوبے میں ان سرمایہ دار ممالک کا معاون ہے۔ پاکستان میں طبقہ اشرافیہ کی بڑھتی دولت اور عوام میں بڑھتی ہوئی بھوک اور غربت یہ سمجھنے کے لیے کافی ہے کہ ملک میں کسانوں کی آمدنی میں اضافے کے لیے جاری ملکی اور غیرملکی منصوبوں سے کس کی آمدنی میں اضافہ ہوا۔

پاکستان بھر کے چھوٹے اور بے زمین کسان مزدوروں کے لیے ایسی صورتحال میں کہ جب دن رات محنت مزدوری کر کے بھی اپنا اور خاندان کا پیٹ بھرنے سے قاصر ہیں ضروری ہے کہ ان کے نسل در نسل چلے آرہے وسائل اور غذائی تحفظ کو ان ملکی اور غیرملکی استحصالی قوتوں سے بچانے کے لیے ان کے خلاف جدوجہد کریں اور اپنا فطری اور قانونی حق ان سے چھین لیں۔

☆ اس مضمون میں موضع کوٹلہ رحم علی، ضلع ملتان کے کسان چاچا اصغر اور حطار، ضلع ہری پور کے کسان فیاض احمد سے مویشیوں کی افزائش نسل، ان کی خوراک اور اس کے مویشیوں پر اثرات کے حوالے سے معلومات اور ان کی رائے بھی شامل کی گئی ہے۔ ادارہ ان دونوں کسانوں کا اس مضمون کی تیاری میں معاونت پر شکرگزار ہے۔

حوالہ جات:

1. Ministry of Finance, Government of Pakistan. "Pakistan Economic Survey 2014-15." Ministry of Finance, Government of Pakistan, 2015,p. 38. Accessed from http://www.finance.gov.pk/survey/chapters_15/02_Agricultre.pdf
2. Pakistan Bureau of Statistics, Government of Pakistan. "Agriculture Census Wing. "Pakistan Bureau of Statistics, Government of Pakistan, 2015. Accessed fromhttp://www.pbs.gov.pk/content/agriculture-census-wing
3. Zia, Umm E. "Pakistan: a dairy sector at a crossroads." Regional Office for the Asia and the Pacific, Food and Agriculture Organization of the United Nations (FAO), Bangkok, January 2009. Accessed fromhttp://www.fao.org/docrep/011/i0588e/i0588e07.htm
4. Bokhari Ashfak. "Focus on feedlot fattening." Dawn, Febraury 9, 2015. Accessed from http://www.dawn.com/news/1162331
5. Ibid
6. Maxim. "Animal Feed. "Maxim-Intl.com, 2009. Accessed from http://www.maxim-intl.com/Products%2011.htm
7. Ministry of Finance, Government of Pakistan. "Pakistan Economic Survey 2014-15." Ministry of Finance, Government of Pakistan, 2015, p. 41. Accessed from http://www.finance.gov.pk/survey/chapters_15/02_Agricultre.pdf
8. Ibid.
9. Ministry of Finance, Government of Pakistan. "Pakistan Economic Survey 2014-15." Ministry of Finance, Government of Pakistan, 2015, p. 38. Accessed fromhttp://www.finance.gov.pk/survey/chapters_15/02_Agricultre.pdf
10. Zia Umm E. "Pakistan: A dairy sector at a crossroads.
11. Cook, Rob. "World beef production: ranking of countries." Beef 2 Live, 2014. Accessed from http://beef2live.com/story-world-beef-production-ranking-countries-0-106885
12. Ministry of Finance, Government of Pakistan. "Pakistan Economic Survey 2014-15." Ministry of Finance, Government of Pakistan, 2015, p. 39. Accessed from

23. Awan, Adeela et al. "A study on chemical composition and detection of chemical adulteration in tetra pack milk samples commercially available in Multan." Pak. J. Pharm. Sci., January 2014. Vol. 27, No.1, pp.183-186. Accessed from
http://www.pjps.pk/wp-content/uploads/pdfs/27/1/Paper-27.pdf
24. Junadi, Ikram. "Farmers protest budget by spilling milk outside parliament." Dawn, June 17, 2015. Accessed from
http://www.dawn.com/news/1188701
25. Factfish. "Pakistan: maize (corn) seed, import value (US $)." Factfish, 2015.Accessed from
http://www.factfish.com/statistic-country/pakistan/maize%20seed%2C%20import%20value
26. Pakistan Agriculture Research. "Maize (corn) crop in Pakistan: area, production and yield of maize."Pakistan Agriculture Research, 2015. Accessed from
http://edu.par.com.pk/wiki/maize/#area-production-and-yield-of-maize
27. Bukhsh, Haji A et al. "Production potential of three maize hybrids as influenced by varying plant density." Pak. J. Agri. Sci.,2008.Vol. 45(4). Accessed from http://www.pakjas.com.pk/papers%5C130.pdf
28. Maxim."Welcome to Maxim International." Maxim-Intl.com, 2009.Accessed from
http://www.maxim-intl.com/
29. Ibid.
30. BIOPRO Baden-Württemberg. "Biogas and sustainability." BIOPRO Baden-Württemberg, 2015. Accessed from
https://www.biooekonomie-bw.de/en/articles/news/biogas-and-sustainability/
31. Aazim,Mohiuddin. "Maize exports on the rise." Dawn, July 22, 2013. Accessed from http://www.dawn.com/news/1030913
32۔ احمد جنید۔ ''چینی کی صنعت کی ترقی: فائدہ کس کا؟''۔ چیلنج، جلد8، شمارہ 1، جنوری تا اپریل 2015، صفحہ 26۔

http://www.finance.gov.pk/survey/chapters_15/02_Agricultre.pdf
13. Ministry of Finance, Government of Pakistan. "Pakistan Economic Survey 2014-15." Ministry of Finance, Government of Pakistan, 2015, p. 41. Accessed from
http://www.finance.gov.pk/survey/chapters_15/02_Agricultre.pdf
14. University of Veterinary and Animal Sciences, Lahore-Pakistan. "UVAS Press Release: USAID, UVAS agree to sign two MoUs to set up policy research center and initiate training programs." University of Veterinary and Animal Sciences, Lahore-Pakistan, 2015. Accessed from http://www.uvas.edu.pk/Press_Release/2015/Feb/04/press.htm
15. USAID and Dairy and Rural Development Foundation. "Dairy Project." USAID Dairy Project, 2012. Accessed from
http://www.dairyproject.org.pk/themes/html/
16. Charles Sturt University. "ASLP Dairy Project." ASLP Pakistan, Accessed from http://aslpdairy.pk/en/
17. Nestlé. "Nestlé opens new milk factory in Pakistan, its largest milk reception plant in the world." March 2007,
Nestlé. Accessed from http://www.nestle.com/media/pressreleases/allpressreleases/milkfactorypaskistan
18. Nestle "Nestlé continues to develop, uplift community." May, 2011, Nestle. Accessed from
http://www.nestle.pk/media/pressreleases/nestle-develop-uplift-community
19. Engro Foods. "A little introduction." Engro Foods, 2012. Accessed from http://www.engrofoods.com/export.html
20۔ مختلف کمپنیوں کے دودھ کے ڈبوں کی قیمت نارتھ کراچی کی مختلف دکانوں سے اگست میں حاصل کیے گئے۔
21. The News. "Engro Food's profitability surges." The News, April 21, 2015. Accessed from http://www.thenews.com.pk/Todays-News-3-313823-Engro-Foods-profitability-surges
22. Canadian Strategy for Cancer Control. "Prevention of occupational and environmental cancers in Canada: a best practices review and recommendations." National Committee on Environmental and Occupational Exposures, 2006. Accessed fromhttp://s.cela.ca/files/uploads/BPReport_Final_May2006.pdf

کھیت مزدور عورتیں: روزگار کی جدوجہد

تحریر: فائزہ شاہد

ایڈیٹرز نوٹ: پچھلے چیلنج ''جنوری تا اپریل 2015، جلد8، شمارہ 1'' میں کھیت مزدور عورتوں پر ایک مضمون ''زراعت سے وابستہ دیہی مزدور عورتوں کی اجرت'' کے نام سے شائع کیا گیا تھا جس میں مزدور عورت پر عمومی معلومات کے علاوہ سندھ کے کچھ اضلاع سے مزدور عورت کو مختلف سبزیوں اور فصلوں کی چنائی، کٹائی پر دی جانے والی اجرت کا ایک جائزہ پیش کیا گیا تھا۔ اس سلسلہ کو آگے بڑھاتے ہوئے اس مضمون میں پنجاب سے ملتان، مظفر گڑھ اور اوکاڑہ سے حاصل کردہ مزید معلومات پیش کی جارہی ہیں۔ ہماری کوشش رہے گی کہ ہم کھیت مزدور عورت کے کردار کو دیہی پیداوار میں واضح کرتے رہیں اور پاکستانی معاشرے میں عورت، خاص کر دیہی عورت کے خلاف ہونے والی معاشی و معاشرتی ناانصافی کو بیان کرسکیں۔

پاکستان ایک دیہی معیشت پر مبنی ملک ہے جس کی تقریباً 70 فیصد عوام دیہات میں رہتی ہے۔ پاکستان میں تعلیم یافتہ افراد کی تعداد اور تعلیمی معیار دونوں ہی سنگین حد تک کم ہیں۔ دیہی عورتیں اور بچیوں میں صرف 34.2 فیصد لکھ پڑھ سکتیں ہیں۔ جبکہ مردوں اور لڑکوں کی شرح 63.6 فیصد ہے۔ مزید ناانصافی ہے کہ دیہی مزدور کو حکومت پاکستان غیر رسمی شعبہ میں شمار کرتی ہے یعنی اس مزدور طبقہ کو پاکستان کا مزدور قانون کوئی تحفظ فراہم نہیں کرتا ہے۔

اس حوالے سے دیہی عورت خاص کر کے کھیت مزدور کئی مسائل کا سامنا کررہی ہے۔ زیادہ تر کھیت مزدور عورت پڑھ لکھ نہیں سکتی۔ اس لیے اپنی آمدنی کے بارے میں صحیح معلومات نہیں رکھ پاتی۔ ایک طرف گھر کے مرد ان کی مزدوری پر اختیار رکھتے ہیں دوسری طرف زمیندار طبقہ عورت کی مزدوری کو کم سے کم رکھتا ہے اور مزدور عورت اپنے لیے بہتر روزگار کے لیے جدوجہد کرنے میں کئی مسائل کا سامنا کرتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ اپنے اوپر ہونے والی زیادتی کو مکمل طور پر سمجھتی ہے۔ مثال کے طور پر سندھ کی مزدور عورتیں خوب سمجھتی ہیں کہ زراعت میں فصل کاٹنے کے لیے مشین کے استعمال سے نا صرف ان کی روزی ماری جاتی ہے بلکہ ان کی غذائی فصلوں تک رسائی بھی کم ہورہی ہے۔[1] اس کے علاوہ زمین کی ملکیت عورتوں میں نہ ہونے کے برابر ہے، حد تو یہ ہے کہ کھیت پر ہر طرح کا کام کرنے کے باوجود عورت کسان کے نام سے نہیں پہچانی جاتی۔ پاکستان جیسے پدر شاہی معاشرے میں گھرانے کے لیے خوراک کا انتظام عورت کے ہاتھ میں ہے۔ عورت اس ذمہ داری کو کس قدر مشکل سے پورا کرنے کی کوشش کرتی ہے دیہی مزدور عورت کی مزدوری کے لیے جدوجہد سے واضح ہے۔ انتہا تو یہ ہے کہ ملتان کے کچے کے علاقوں میں جہاں ہر چوتھے چھٹے ماہ سیلابی صورت حال ہوتی ہے، مزدور عورت ان حالات میں بھی کبھی کھڑے پانی میں چل کر اور کبھی مقامی کشتیوں میں بیٹھ کر مزدوری کی تلاش میں ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں تک پہنچنے کی پوری کوشش کرتی ہے۔

تحقیق کا طریقہ کار

اس مضمون کو لکھنے کے لیے پنجاب کے ضلع ملتان کے دو گاؤں کانواں والی اور حماد پور جبکہ ضلع مظفر گڑھ کے ایک گاؤں اور ضلع اوکاڑہ کی تحصیل دیپالپور کے ایک گاؤں سے معلومات حاصل کی گئیں۔ ہر گاؤں میں تفصیلات حاصل کرنے کے لیے فوکس گروپ تشکیل دیے گئے جن میں کم از کم چھ عورتیں اور زیادہ سے زیادہ 15 عورتیں شامل تھیں۔ ان علاقوں میں لگائی جانے والی سبزیوں، پھلوں اور دیگر فصلوں کے بارے میں اکٹھی کی جانے والی معلومات کا زاویہ اجرت، مزدوری کے اوقات کار، فصل کا دورانیہ، کٹائی اور چنائی پر مشتمل تھا۔ مذکورہ دیہاتوں کے پھلوں میں خربوزہ، تربوز اور اسٹرابری جبکہ سبزیوں میں چھولیا، بھنڈی، کریلے، اروی، آلو، مٹر، توری، کدو اور غذائی اجناس میں گندم کے علاوہ نقد آور فصلوں میں مکئی، تمباکو، کپاس اور چاول شامل ہیں۔

اس کے علاوہ کھیت مزدور عورتوں کی روزمرہ زندگی کے بارے میں جاننے کے لیے ضلع ملتان کے گاؤں کانواں والی اور لوٹکی والا اور ضلع مظفر گڑھ کے گاؤں سامٹی کی تین سے چار عورتوں سے بات چیت (انٹرویو) بھی کی گئی۔

عورت کھیت مزدور: غیر رسمی مزدوری کے دیگر پہلو

مختلف اجناس کی فصل پر کام کرنے کی مزدوری مختلف طریقوں سے ادا کی جاتی ہے مثلاً پورے دن کے حساب سے، وزن کے حساب سے، بوری کے حساب سے اور بعض کی فی ایکڑ کے حساب سے اجرت دی جاتی ہے۔ کسان مزدور عورتیں صبح آٹھ بجے سے دوپہر دو بجے تک مسلسل کٹائی اور چنائی کا کام کرتی ہیں اگر کام دو بجے سے پہلے ختم ہو جائے تو کھیت مالکان دیگر کاموں میں لگا دیتے ہیں، گھر جانے نہیں دیتے۔

کسان عورتوں کا کہنا ہے کہ وہ کھیت میں دلجوئی سے کام کرتی ہیں اور کم وقت میں زیادہ کام نمٹانے کی کوشش کرتی ہیں تا کہ ان کو دوبارہ کھیت مزدوری کے لیے بلایا جائے۔ اگر کوئی کسان مزدور عورت تیز کام نہیں کرتی تو مالک اگلی فصل پر اس کو نہیں بلاتا۔ اس صورت میں کسان مزدور عورتوں کو کھیت کھیت جا کر کام مانگنا پڑتا ہے۔

مالکان بچوں کو خاص طور پر شیر خوار بچوں کو بھی کام میں حرج ہونے کی وجہ سے ساتھ نہیں لانے دیتے۔ گھر میں موجود بڑی بزرگ عورتیں بچوں کی دیکھ بھال کرتی ہیں ورنہ بڑے بہن، بھائی اپنے سے چھوٹے بہن بھائیوں کی نگرانی کرتے ہیں۔ کھیت مزدوری پر جانے سے پہلے عورتیں کھانا اور دیگر کام ختم کرتی ہیں اس طرح ان کو دہری ذمہ داری نبھانی پڑتی ہے۔

المیہ یہ ہے کہ خوراک کے حصول کے لیے مرد اور عورت دونوں مل کر محنت کرتے ہیں لیکن پھر بھی ان کی بنیادی ضروریات پوری نہیں ہوتیں۔ سونے پہ سہاگہ یہ کہ سال کے کتنے ہی دن ان کو روزگار نہیں ملتا۔ زراعت کے شعبے میں مشینری کے استعمال اور جدت سے کسان مزدوروں کو فائدے کے بجائے نقصان اٹھانا پڑا ہے۔ مذکورہ بالا صورتحال بھی اسی کا پیش خیمہ ہے۔ جس گاؤں میں عورتیں کھیت مزدوری کے لیے زیادہ ہوں وہاں اجرت کم دی جاتی ہے اور جہاں کم عورتیں ہوں وہاں نسبتاً زیادہ مزدوری مل جاتی ہے۔

سبزیاں اور پھل

کدو، خربوزہ، تربوز، توریاں، اسٹرابری، گوبھی، تمباکو اور مکئی کی فصلوں پر صبح آٹھ بجے سے دوپہر دو بجے تک کی یومیہ اجرت عموماً 120 سے 150 روپے تک ہوتی ہے۔ سبزیوں کی کٹائی/چنائی سے پہلے ہونے والی گوڈی مزدور عورتوں کو چھ گھنٹے کے حساب سے صرف 100 روپے دی جاتی ہے۔ تمام اجناس کی کاشت اگیتی یعنی صحیح وقت پر اور پچھیتی یعنی تھوڑے دن دیر سے ہونے پر کٹائی/چنائی میں 10 سے 15 دن کا فرق پڑتا ہے۔

خربوزہ، تربوز

ضلع ملتان کے گاؤں موراں والی اور کاواں والی میں خربوزہ اور تربوز کی کاشت سے چنائی تک کا دورانیہ نومبر سے اپریل تک کا ہوتا ہے۔ مارچ کے آخری ہفتے سے اپریل کے پورے مہینے میں چنائی ہوتی ہے۔ ان دونوں فصلوں کو نرم زمین کی ضرورت ہوتی ہے اس لیے یہ کچے کے علاقے میں کاشت کی جاتی ہیں۔ چھوٹے زمیندار خربوزے اور تربوز کی فصل کی چنائی میں اکثر مزدور عورتوں کو کام نہیں دیتے، خود کر لیتے ہیں لیکن جن مالکان کی زیادہ رقبے پر خربوزے اور تربوز کاشت ہوتے ہیں وہ پھر کام مزدور عورتوں کو دیتے ہیں۔ عورتیں بیل سے خربوزے اور تربوز کو الگ کرتی ہیں اور آدمی ان کو اٹھا کر گاڑی میں بھرتے ہیں۔ آدمیوں کو ایک دن کی مزدوری 350 روپے ملتی ہے اور عورتوں کی دیہاڑی صرف 120 سے 150 روپے تک ہوتی ہے۔

جن سبزیوں کی کلو کے حساب سے اجرت دی جاتی ہے ان میں چھولیا، بھنڈی اور کریلے شامل ہیں۔ چھولیا ایک دیسی مٹر ہے یہ زیادہ تر ملتان کے کچے کے علاقے میں کاشت کیا جاتا ہے۔

چھولیا

چھولیے کی کاشت سے چنائی تک کا دورانیہ نومبر سے اپریل تک کا ہوتا ہے۔ چھولیے کی چنائی مارچ میں شروع ہوکر اپریل کے آغاز تک رہتی ہے۔ جس کی مزدوری پانچ روپے فی کلو کے حساب سے دی جاتی ہے۔ ایک مزدور عورت عام طور سے صبح آٹھ بجے سے دوپہر دو بجے تک 10 کلو تک چن پاتی ہے یعنی چھ گھنٹے کی مزدوری صرف 50 روپے بنتی ہے۔ کسان عورتوں کا کہنا ہے کہ اگر چھولیا کہ اندر دانے ہوں تو ان کی اجرت صحیح مل جاتی ہے لیکن اگر چھولیے کے دانے نہ ہوں تو وزن کم ہونے کی وجہ سے محنت تو اتنی ہی لگتی ہے مگر اجرت کم ہو جاتی ہے۔

بھنڈی اور کریلے

ملتان کے گاؤں کانواں والی اور مظفر گڑھ کے گاؤں سامٹی میں بھنڈی اور کریلے کی کاشت سے چنائی تک کا دورانیہ اپریل سے جون تک کا ہوتا ہے۔ بھنڈی اور کریلے کی چنائی مئی کے آخری ہفتے سے شروع ہوکر جون کے پورے مہینے ہوتی ہے۔ بھنڈی کی مزدوری صرف ڈھائی روپے فی کلو کے حساب سے ملتی ہے۔ چھ گھنٹوں میں مزدور عورت تقریباً 20 کلو توڑ پاتی ہیں اور یوں صبح آٹھ بجے سے دو بجے تک کی مزدوری صرف 50 روپے ہی بنتی ہے۔ ایک ایکڑ پر سات سے آٹھ عورتیں ہر تیسرے دن چنائی کرتی ہیں۔ یہ چنائی تقریباً ایک سے ڈیڑھ مہینے تک چلتی ہے۔ بھنڈی کی فصل میں کانٹے ہونے کی وجہ سے اس کی چنائی میں دستانوں یا کپڑا باندھنے کے باوجود ہاتھ زخمی ہوجاتے ہیں۔ کریلے کی مزدوری بھی بھنڈی کی طرح ڈھائی روپے فی کلو کے حساب سے ملتی ہے۔ عورتیں صبح آٹھ سے دوپہر دو بجے تک 40 کلو توڑ پاتی ہیں۔ اس طرح پورے دن کی آمدنی 100 روپے ہی بنتی ہے۔

جن سبزیوں کی مزدوری فی بوری کے حساب سے دی جاتی ہے ان میں اروی، آلو اور مٹر شامل ہیں۔

اروی

ملتان کے گاؤں کانواں والی اور مظفر گڑھ کے گاؤں سامٹی میں اروی کی کاشت سے چنائی تک کا دورانیہ مارچ سے اگست تک ہوتا ہے۔ اس چھ مہینے کی فصل میں زیادہ کام آخری دو مہینوں میں اروی کی چنائی کا ہوتا ہے جو کہ جولائی سے شروع ہوکر اگست تک

چلتا ہے۔ اروی نکالنے کے لیے عورتوں کے ساتھ مرد بھی کام کرتے ہیں۔ مرد مزدور زمین سے اروی نکالتے جاتے ہیں اور عورتیں اروی صاف کرکے بوری بھرتی جاتی ہے۔ اروی کی مزدوری 40 کلو کی بوری کے حساب سے 80 روپے دی جاتی ہے جس میں 50 روپے عورت کو جبکہ 30 روپے آدمی کو ملتے ہیں۔ اس طرح دونوں مل کر ایک دن میں تین سے چار بوری بھر لیتے ہیں۔ اگر مرد مزدور نہ مل رہے ہوں تو اس وقت دو مزدور عورتیں زمین سے اروی نکالتی بھی ہیں اور صاف کرکے بوری بھی بھرتی ہیں۔ ایسی صورت میں بوری کی تعداد کم ہوکر دو سے تین رہ جاتی ہیں۔ اس صورت میں کسان عورت کو کام تو زیادہ محنت طلب کرنا پڑتا ہے لیکن اس کی اجرت کم ہو جاتی ہے۔

آلو

آلو کی فصل کا دورانیہ اکتوبر سے جنوری تک ہوتا ہے۔ ضلع مظفر گڑھ کے گاؤں سامٹی میں آلو کا بیج مشین کے ساتھ ساتھ ہاتھ سے بھی لگایا جاتا ہے جو کہ پانچ سے چھ مزدور صبح آٹھ بجے سے دوپہر 12 بجے تک ایک ایکڑ پر لگا دیتے ہیں۔ جس کی اجرت 2,000 روپے دی جاتی ہے۔

آلو کی فصل کی چنائی عام طور سے دسمبر اور جنوری کے مہینے میں کی جاتی ہے۔ ایک مقامی کاشت کار کے مطابق آلو کی چنائی دو طرح سے کی جاتی ہے۔ ایک کچی چنائی کہلاتی ہے جب کہ دوسری پکی چنائی کہلاتی ہے۔ کچی چنائی میں جو آلو پکتے رہتے ہیں ان کو نکال کے سبزیوں کے ساتھ منڈی میں بیچتے رہتے ہیں یہ مقدار میں کم ہوتے ہیں۔ اصل چنائی پکی چنائی ہوتی ہے۔ اس میں تمام آلو زمین سے نکال کر بیج کے لیے اور منڈی میں بیچنے کے لیے الگ الگ کیے جاتے ہیں۔ آلو کی چنائی کی اجرت 40 روپے فی بوری کے حساب سے ملتی ہے۔ کھیت مزدور عورتیں صبح آٹھ بجے سے دوپہر دو بجے تک تقریباً پانچ بوری بھر لیتی ہیں۔ 25 سے 30 مزدور عورتیں ایک دن میں ایک ایکڑ مکمل کرتی ہیں جبکہ مشین ایک ایکڑ سے دو گھنٹے میں ہی آلو نکال دیتی ہے۔ مزدور عورتوں کو صرف بوری بھرنی ہوتی ہے جس کی اجرت انہیں 15 روپے فی بوری کے حساب سے ملتی ہے۔ ایک عورت چھ گھنٹوں میں تقریباً 10 بوری بھر لیتی ہے۔ ایک ایکڑ پر 20 عورتیں مزدوری کرتی ہیں۔ آلو کی فصل پر ہاتھ اور مشین سے کام کرنے کے درمیانی فرق کا تناسب 20 دن اور ایک ہفتہ ہے اس فرق سے بھی کسان مزدور عورتوں کی آمدنی میں واضح فرق آ جاتا ہے۔

اب اس علاقے میں ایک اور مشین آ گئی ہے جو کہ ایک وقت میں کئی کھلیوں سے آلو نکالتی بھی ہے اور آلو کو مٹی سے الگ کرنے کے ساتھ ساتھ چھوٹے اور بڑے آلوؤں کو بھی الگ کر دیتی ہے۔ ایسی صورت میں کھیت مزدور عورت کو آلو زمین سے چننے بھی نہیں ہوتے صرف بوری بھرنی ہوتی ہے۔ اس کام کی مزدوری صرف پانچ روپے فی بوری کے حساب سے ملتی ہیں۔ ایک ایکڑ سے زیادہ سے زیادہ 100 بوریاں اور کم سے کم 50 اور اوسطاً 70 بوریاں آلو کی نکل آتی ہیں۔ اس طرح عورتوں کی مزدوری میں مزید کمی واقع ہو جاتی ہے۔

ضلع اوکاڑہ کی تحصیل دیپالپور میں کسان عورتیں گروہ کی صورت میں کام کرتی ہیں۔ وہاں پر آلو کا بیج ہاتھ سے بہت کم، زیادہ تر مشین سے لگایا جاتا ہے۔ اگر ہاتھ سے آلو کا بیج لگایا جائے تو مزدوری 500 سے 600 روپے فی ایکڑ دی جاتی ہے۔ پانچ سے چھ عورتیں ایک دن میں ایک ایکڑ مکمل کر لیتی ہیں۔

کسان مزدور عورت کو آلو چننے کا 4,000 فی ایکڑ دیا جاتا ہے۔ 15 سے 20 کسان عورتیں ایک دن میں ایک ایکڑ مکمل کر لیتی ہیں ۔ یہاں پر چونکہ ایکڑ کا ٹھیکہ دیا جاتا ہے تو وقت کی قید نہیں ہوتی رقم ٹھیکے کے مطابق ادا کی جاتی ہے۔ آلو کی فصل زیادہ کاشت کی جانے کی وجہ سے مزدور عورتوں کو تقریباً تین مہینے تک مزدوری ملتی رہتی ہے۔

ضلع اوکاڑہ میں بھی مشین سے آلو نکالے جاتے ہیں، اگر زمین سے آلو مشین نکالے اور اس کو مٹی سے الگ بھی کرے تو ایسی صورت میں آدمی مشین کے پیچھے بوری پکڑے رکھتے ہیں اور آلو بوری میں بھرتے جاتے ہیں۔ ابھی تک یہ مشین صرف بڑے زمیندار ہی استعمال کر رہے ہیں جو دو سال سے ہی اس علاقے میں آئی ہے ۔ مشین سے آلو نکالتے ہوئے اکثر آلو کٹ جانے کی وجہ سے ضائع بھی ہوتے ہیں۔

جس زمین پر عورتیں ہاتھ سے چار دن میں آلو نکالتی تھی اور بوری بھی بھرتی تھیں اب وہاں مشین ایک دن میں ساری زمین کے آلو نکال دیتی ہے۔ مزید یہ کہ دوسری بڑی مشین پر یا تو عورتوں کو مزدوری ملتی ہی نہیں صرف آدمیوں کو ملتی ہے یا پھر نہ ہونے کے برابر ملتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں پہلے زمین پر چار عورتیں کام کرتی تھیں پھر مشین آنے کی وجہ سے صرف ہاتھ سے آلو چننے کے لیے دو عورتیں کام کرنے لگیں اور اب دوسری بڑی مشین آنے کی وجہ سے صرف بوری بھرنے کے لیے آدمی کو مزدوری ملتی ہے وہاں عورت کو ملتی ہی نہیں ہے۔ مزدور عورتوں کو گاڑی میں بھرنے کی مزدوری بھی نہیں ملتی کیونکہ روایت یہ ہے کہ کام یہ آدمیوں کا ہے عورتیں نہیں کر سکتی ہیں۔ اگر کوئی عورت کرنا بھی چاہے تو وہاں کا معاشرہ اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ یہ کام کرے۔ آدمیوں کو بوری کو بند کرنے اور گاڑی میں لوڈ کرنے کی مزدوری 350 روپے ملتی ہے۔ جس میں بھی بتدریج کمی واقع ہو رہی ہے۔

ملتان کے پکے کے علاقے لوٹکی والا میں ایک کاشت کار کا کہنا ہے کہ وہ اپنی فصل پر آلو نکالنے کے لیے دوسرے علاقے سے کسان مزدور عورتوں کو لے کر آتا ہے کیونکہ مقامی عورتیں زیادہ دیر میں کام کرتی ہیں اور ان کو آلو کی فصل پر مزدوری کرنے میں مہارت حاصل نہیں ہے جبکہ اس کی لائی ہوئی کسان مزدور عورتیں زیادہ مہارت سے کام کرتیں ہیں۔ کسان مزدور عورتیں بعض اوقات مقامی رقبے پر مزدوری حاصل نہیں کر پاتیں جس سے ان کی زندگی مشین کی وجہ سے روزگار نہ ملنے پر پہلے ہی مشکل میں تھی اب مزید مشکلات کا سامنا ہے۔

مٹر

ملتان کے گاؤں کانواں والی، مظفر گڑھ کے گاؤں سامٹی اور اوکاڑہ کی تحصیل دیپالپور میں مٹر کی فصل کا دورانیہ نومبر سے فروری ہوتا ہے۔ مٹر کی فصل کی چنائی جنوری کے آخری ہفتے سے شروع ہوکر فروری کے پورے مہینے تک رہتی ہے۔ زیادہ مزدوری چنائی کے مہینے میں ملتی ہے جس کا دورانیہ ایک سے ڈیڑھ مہینہ ہوتا ہے۔ ملتان کے گاؤں کانواں والی اور مظفر گڑھ کے علاقے سامٹی میں مٹر توڑ کر بوری بھرنے کی اجرت 30 روپے فی بوری کے حساب سے دی جاتی ہے۔ ایک عورت صبح آٹھ بجے سے دوپہر دو بجے تک یعنی چھ گھنٹوں میں زیادہ سے زیادہ دو بوریاں بھر پاتی ہے۔ ایک بوری میں 25 سے 26 کلو مٹر آتے ہیں۔

ضلع اوکاڑہ میں 50 کلو کی ایک بوری بھرنے کی اجرت 150 روپے ہے۔ مزدور عورت صبح چھ بجے سے دوپہر ایک بجے یعنی سات گھنٹے میں ایک بوری بھر پاتی ہے۔ اگر گھر میں مزدوری کرنے والی دو عورتیں ہیں تو ایک جلدی چلی جاتی ہے اور دوسری گھر کا کام کر کے جاتی ہے۔ پھر مزدوری کی اجرت آپس میں بانٹ لیتی ہیں۔

توری، کدو

ملتان کے گاؤں حماد پور میں توری کا دورانیہ اپریل سے جون تک کا ہے۔توری اور کدو کی چنائی جون کے مہینے میں کی جاتی ہے۔ ایک مہینے کے دوران چار سے پانچ دن کے وقفے سے چنائی کی جاتی ہے۔ ایک ایکڑ پر 10 عورتیں مزدوری کرتی ہیں اور ایک عورت کو 100 روپے مزدوری دی جاتی ہے۔ کسان مزدور عورتوں کو پکانے کے لیے بھی دو سے تین کلو توری، کدو دیئے جاتے ہیں۔

نقد آور فصلیں

اسٹرابری

اسٹرابری کی کاشت سے لے چنائی تک کا دورانیہ دسمبر کے آخری ہفتے سے مارچ تک ہوتا ہے۔اسٹرابری کی چنائی فروری کے آخر سے شروع ہوکر مارچ تک رہتی ہے۔ اسٹرابری ایک نقد آور فصل ہے۔ یہ زیادہ تر ٹھنڈے علاقوں میں کاشت کی جاتی تھی لیکن اب ملتان کے کچے کے علاقوں میں بھی کاشت کی جارہی ہے جہاں پہلے گندم کاشت کی جاتی تھی۔ اسٹرابری کی نسبت گندم کی مزدوری میں چند دن کی مزدوری سے کئی مہینے کی خوراک جمع ہو جاتی تھی۔

ضلع ملتان کے گاؤں کانواں والی کی کھیت مزدور عورت پروین کا کہنا ہے روزانہ کی بنیاد پر اسٹرابری کی مزدوری کرنے سے ہاتھوں کی کھال چھل جاتی ہے۔ اگر کوئی اچھے زمین مالک ہوں تو وہ ان سے پوچھ کر اسٹرابری کی فصل سے حاصل ہونے والا گھاس پھوس جانوروں کے چارے کے لیے کشتی میں رکھ کر گھر لے جاتیں ہیں۔ غور طلب بات یہ ہے کہ کسان مزدور عورتیں جو گاؤں میں ہی رہتی ہیں اور جن کا تعلق بھی زراعت کے شعبے سے ہی ہے ان کے پاس بھی جانوروں کو ڈالنے کے لیے چارہ میسر نہیں ہے۔ حالیہ بارشی سیلاب کی وجہ سے بہت سا زیر کاشت رقبہ سیلاب کی نظر ہو گیا۔ پروین کا گھر بھی دریا کے دوسری طرف ہے وہ ہر روز کشتی میں بیٹھ کر آتی ہے اور اسٹرابری کے کھیت کی مزدوری کرتی ہے۔

مکئی

مکئی سال میں دو بار کاشت کی جاتی ہے، ایک بہاریاں مکئی کہلاتی ہے جب کہ دوسری موسمی مکئی کہلاتی ہے۔ بہاریاں مکئی کا دورانیہ فروری سے لے کر مئی تک ہوتا ہے۔مکئی کی کٹائی مئی کے مہینے میں ہوتی ہے جس کا دورانیہ تقریباً ایک مہینہ ہوتا ہے۔ موسمی مکئی کا دورانیہ جولائی سے اکتوبر تک ہوتا ہے۔ اس کی پیداوار بھی کم ہوتی ہے جبکہ بہاریاں مکئی کی پیداوار زیادہ ہوتی ہے۔

ضلع اوکاڑہ میں مکئی کے پودوں میں زنک ڈالا جاتا ہے۔ کھیت مزدور عورتیں ہاتھوں پر تھیلیاں پہن کر ایک ایک پودے میں زنک ڈالتی ہیں جس کی اجرت ان کو 800 روپے فی ایکڑ کے حساب سے دی جاتی ہے۔ زنک ڈالنے کا کام چار سے پانچ عورتیں مل کر ایک گھنٹے میں کر لیتی ہیں۔مکئی کاٹنے اور چھیلنے کے 4,000 روپے فی ایکڑ کے حساب سے دیئے جاتے ہیں۔ پانچ سے چھ مزدور عورتیں دو دن میں ایک ایکڑ مکمل کرلیتی ہیں۔ لیکن اب اس علاقے میں مکئی کاٹنے کی مشین آرہی ہے جو مکئی کاٹتی بھی ہے، سٹے الگ بھی کرتی ہے اور پھر دانے بھی الگ کرتی ہے۔ یہ مشین بڑے زمیندار استعمال کرتے ہیں۔ اس مشین کے استعمال سے بیج ضائع ہوکر زمین پر گرتا ہے لیکن بڑے زمینداروں کو اتنی پرواہ نہیں ہوتی وہ جلد از جلد زمین خالی کرنا چاہتے ہیں تا کہ دوسری فصل کاشت کرسکیں۔

چھوٹے کاشت کاروں کی کوشش ہوتی ہے کہ گھر کی عورتیں ہی مزدوری کر لیں جبکہ بڑے زمینداروں کی کوشش ہوتی ہے کہ کھیت مزدور عورتوں کے لیے بھاگ دوڑ نہ کرنی پڑے مشین سے ہی کام کروا لیا جائے۔ دونوں صورتوں میں کھیت مزدور عورتوں کا نقصان ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کام نہ ملنے کی صورت میں اجرت کا سوال ہی نہیں ہوتا۔ مزید یہ کہ جو عورتیں اپنی زمین پر کام کر رہی ہیں ان کو بھی اجرت کی مد میں کچھ نہیں دیا جاتا۔

چاول

ضلع اوکاڑہ میں چاول کی کاشت کا دورانیہ جون سے اکتوبر تک ہوتا ہے۔ چاول کی کٹائی اکتوبر کے مہینے میں کی جاتی ہے۔چاول کی پنیری کو پہلے منتقل کیا جاتا ہے جس

کے کسان مزدور عورتوں کو 3,500 سے 4,000 روپے فی ایکڑ ملتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر عورتیں زیادہ ہوتیں ہیں تو کم پیسے ملتے ہیں اگر عورتیں کم ہوتی ہیں تو زیادہ پیسے ملتے ہیں۔ضلع اوکاڑہ کی کسان مزدور عورتیں گروپ کی صورت میں کام کرتی ہیں، ایک گروپ میں تقریباً 11 عورتیں ہوتی ہیں جو دو دن میں ایک ایکڑ مکمل کر لیتی ہیں۔ ایک ایکڑ کی کٹائی اور صفائی کے ان کو چار من چاول ملتے ہیں۔ کسان مزدور عورتوں کے لیے چاول کی صفائی ایک مشکل ترین مرحلہ ہے۔ چاول کو زور سے جھٹکنے کی وجہ سے ان کی پسلیوں میں درد ہونے لگتا ہے۔ چاول اور گندم کی کٹائی کے وقت وہ اپنے بچوں کو بھی کام پر لگاتی ہیں تا کہ زیادہ سے زیادہ چاول اور گندم اکٹھا کر سکیں۔

تمباکو

مظفر گڑھ کے گاؤں سامٹی میں تمباکو کی کاشت کی جاتی ہے۔ جس کا بوائی سے چنائی تک کا دورانیہ مارچ سے لے کر جولائی تک ہوتا ہے۔ تمباکو کی بوائی بھی چاول کی طرح ہوتی ہے پہلے پنیری تیار کی جاتی ہے پھر اس کو منتقل کیا جاتا ہے۔ ایک ایکڑ پر پنیری کی منتقلی پانچ سے چھ کسان عورتیں چھ گھنٹے میں مکمل کرتی ہیں جس کی مزدوری ان کو 1,200 روپے دی جاتی ہے۔ گندم کی فصل کے بعد سیلاب کے ڈر کی وجہ سے تین مہینے کے دورانیہ کی فصلیں کاشت کرنے کو ترجیح دی جاتی ہے چونکہ تمباکو بھی تین مہینے میں تیار ہو جاتا ہے اس لیے کسان تمباکو کاشت کرتے ہیں۔ تمباکو کی چنائی جون اور جولائی کے مہینے میں کی جاتی ہے۔ دوبارہ بوائی کے لیے بیج پھول سے حاصل کیا جاتا ہے۔ تقریباً 20 عورتیں ایک دن میں ایک ایکڑ کی چنائی کر لیتی ہیں جس کے لیے انہیں ایک دن میں دو دفعہ آنا پڑتا ہے پہلے وہ صبح آٹھ بجے آتی ہیں اور گیارہ بجے تک تمباکو کو کاٹ کر پھیلا دیتی ہیں پھر اسی دن دوبارہ دو بجے سے پانچ بجے تک تمباکو کو صاف کرتی ہیں۔ عورتوں کو اکثر شام پانچ بجے سے زیادہ وقت ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے ان کے گھر کے کام متاثر ہوتے ہیں لیکن اجرت باقی سبزیوں کے حساب سے یعنی ایک دن کے 120 روپے ہی دی جاتی ہے۔ روزگار نہ ہونے کی وجہ سے کسان مزدور عورتیں کام، وقت اور محنت زیادہ ہونے کے باوجود کم اجرت اور ایک دن میں دو دفعہ آ کر مزدوری کرنے پر مجبور ہیں۔

تمباکو کی ایک من کی بوری 4,000 روپے کی بکتی ہے اور ایک ایکڑ سے 30 سے 40 من تمباکو حاصل کیا جاتا ہے۔ تمباکو کی فصل کو بیوپاری خود آ کر کسان سے خریدتے ہیں جبکہ دوسری اجناس کو کسان خود منڈی میں لے جا کر بیچتے ہیں۔

کپاس

کپاس کی کاشت سے چنائی تک کا دورانیہ فروری سے نومبر تک ہوتا ہے۔ اکتوبر کے مہینے سے کپاس کی چنائی شروع ہو جاتی ہے اور نومبر کے پورے مہینے تک رہتی ہے۔

ضلع اوکاڑہ کی تحصیل دیپالپور کی کھیت مزدور عورتوں کو کپاس کا بیج ہاتھ سے لگانے کی مزدوری 600 روپے فی ایکڑ کے حساب سے دی جاتی ہے۔ چار سے پانچ کسان عورتیں ہوں تو دو گھنٹے میں ایک ایکڑ مکمل ہو جاتا ہے لیکن اب مشین کے ذریعے بیج لگائے جانے کی وجہ سے وہ بیج لگانے کی مزدوری حاصل نہیں کر پاتیں۔ کپاس کی گوڈی کی مزدوری 2,000 روپے فی ایکڑ کے حساب سے دی جاتی ہے۔ ایک ایکڑ پر گوڈی کرنے میں پانچ سے سات عورتوں کو دو دن لگتے ہیں۔

کپاس کی اجرت پانچ روپے فی کلو کے حساب سے دی جاتی ہے۔ کپاس کے پورے موسم میں دو سے تین بار چنائی کی جاتی ہے اور ہر چنائی میں 15 سے 20 دن کا فرق ہوتا ہے۔ کسان مزدور عورتوں کے لیے پہلی چنائی مشکل ہوتی ہے کیونکہ کپاس دور دور لگی ہوتی ہے۔ کپاس کے ٹینڈے مکمل طور پر کھلے ہوئے نہیں ہوتے ہیں اس لیے زیادہ وقت میں کم کپاس چنی جاتی ہے۔ پہلی چنائی پر ایک دن میں 15 سے 20 کلو چن پاتیں ہیں۔ دوسری چنائی آسان ہوتی ہے، دن میں 30 سے 40 کلو تک چن لیتی ہیں جبکہ تیسری چنائی بھی مشکل ہوتی ہے کیونکہ کپاس کم رہ جاتی ہے کہیں کہیں ہوتی ہے۔ اس چنائی میں کسان مزدور عورتیں 20 سے 25 کلو ہی چن پاتی ہیں۔ پہلی اور تیسری چنائی میں محنت زیادہ لگتی ہے جبکہ اجرت تمام چنائی کی ایک جیسی ہوتی ہے۔ کسان مزدور عورتیں گرمی کی وجہ سے عموماً علی الصبح کام شروع کر کے 12 بجے تک مزدوری کرتی ہیں۔ گرمیوں میں کھیت مزدوری کرنا سردیوں کی نسبت مشکل ہوتا ہے۔

کپاس کی مزدوری کپاس کی صورت میں بھی ادا کی جاتی ہے۔ اگر ایک عورت 16 کلو کپاس چنتی ہے تو ایک ایک کلو کی 16 ڈھیریاں بنائی جاتی ہیں اور ان میں سے ایک اور آدھی ڈھیری کھیت مزدور عورت کو دی جاتی ہے باقی کپاس مالک کی ہوتی ہے۔ کھیت مزدور عورتوں کے مطابق وہ کپاس کے بدلے کپاس لینے میں زیادہ خوش ہوتیں ہیں۔ اس طرح سے حاصل ہونے والی کپاس کو وہ اپنی مرضی سے دکان پر بیچ دیتی ہیں یا پھر اپنی ضرورت کے مطابق بستر بناتیں ہیں۔

غذائی اجناس

گندم

گندم کی کٹائی کی مزدوری فی ایکڑ کے حساب سے دی جاتی ہے۔ گندم نومبر میں بوئی جاتی ہے جبکہ اپریل میں کاٹی جاتی ہے۔ اپریل کی 13 تاریخ سے گندم کی کٹائی شروع ہو جاتی ہے جو کہ 15 سے 20 دن چلتی ہے۔ ضلع ملتان اور ضلع مظفر گڑھ میں گندم کی مزدوری فی ایکڑ ڈھائی من گندم دی جاتی ہے۔ گندم کی کٹائی میں عورتیں گروپ بنا کر کام کرتی ہیں۔ ایک گروپ میں چار سے پانچ عورتیں شامل ہوں تو ایک ایکڑ تقریباً چار دن میں مکمل ہوتا ہے۔ گندم کی کٹائی چونکہ صرف 15 سے 20 دن تک چلتی ہے۔ ان کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ رقبے کی کٹائی کر لیں لیکن کسان عورتوں کو

یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ انہوں نے کتنے ایکڑ کی کٹائی کی ہے آخر میں جتنی گندم مزدوری سے حاصل ہوتی ہے اس کو آپس میں بانٹ لیتی ہیں۔ کسان مزدور عورتوں کے مطابق فی بندہ کے حساب میں زیادہ سے زیادہ چار سے پانچ من گندم آتی ہے۔ یہ گندم ان کی پانچ سے چھ مہینے کی خوراک ہوتی ہے بارش کے ڈر سے زمیندار باہر سے بھی مزدور عورتیں لے کر آتے ہیں اور جلدی کٹائی کروانے کی کوشش کرتے ہیں۔

گندم کی کٹائی اور تھریشر کے بعد جب زمین خالی ہو جاتی ہے تو مزدور عورتیں صبح صبح کھیتوں میں اپنے پیچھے چادر باندھ کر گرے ہوئے گندم کے سٹے چنتی ہیں اور چادر میں ڈالتی جاتی ہیں اس طرح ایک یا دو من گندم محنت طلب مرحلے کے بعد حاصل ہو جاتا ہے۔ اتنی محنت وہ صرف اور صرف خوراک کے حصول کے لیے کرتیں ہیں۔ کسان عورتوں کا کہنا ہے کہ جہاں پر گندم کاشت کی جاتی تھی اب وہاں اکثر نقد آور فصلیں جیسے کے اسٹرابری کاشت کی جارہی ہے جس کی وجہ سے گندم کے حصول میں مشکلات کا سامنا ہے۔

ضلع اوکاڑہ کی تحصیل دیپالپور میں گندم کی مزدوری فی ایکڑ تین من دی جاتی ہے۔ مگر اس علاقے کے نئے ٹھیکیدار اپنے مزدور ساتھ لاتے ہیں جس کی وجہ سے وہاں کی مقامی کھیت مزدور عورتوں کی روزی مشکل میں پڑ جاتی ہے۔

خلاصہ

سبزیوں کی مزدوری سے ماہانہ اجرت ایک کسان عورت کو زیادہ سے زیادہ 3,000 روپے حاصل ہوتی ہے جس سے وہ گھر کا گزارا کرنے میں اپنے شوہر کا ہاتھ بٹاتی ہے۔ لیکن کچے کے علاقے میں اگست اور ستمبر کے مہینوں میں کھیت کی مزدوری نہ ہونے کے برابر ہوتی ہے تو آدمی شہر میں مزدوری کرتے ہیں۔ کچے کے علاقوں میں ان مہینوں میں سیلاب کی وجہ سے روزگار کا حصول اور بھی مشکل ہو جاتا ہے کیونکہ سیلاب کے دنوں میں ان کو عارضی نقل مکانی کر کے بند پر یا کہیں اور بسیرا کرنا ہوتا ہے۔ مزدور عورت روزگار نہیں کما پاتی۔ کسان مزدور عورتوں کا کہنا ہے کہ ''ایک تو ہم گھر میں نہیں ہوتے۔ دوسرا ہمارے مرد کمانے جائیں یا ہماری حفاظت کے لیے ہمارے ساتھ رہیں''؟ اس طرح یہ لوگ دہری مشکل میں پھنس جاتے ہیں۔ ایسی صورت حال میں چند خاندان اکٹھے ایک جگہ رہتے ہیں اور پھر مرد شہر میں مزدوری کرنے جاتے ہیں۔ کچھ خاندان جانور کے دودھ سے گزارا کرتے ہیں بہت مشکل پڑنے پر جانوروں کو بیچ بھی دیتے ہیں۔

حاملہ عورتیں یا پھر وہ کسان مزدور عورتیں جن کو کسی وجہ سے کھیت مزدوری نہیں ملتی وہ گھر میں بیٹھ کر 30 روپے فی چادر کے حساب سے چادروں پر شیشے لگاتی ہیں جبکہ شیشے بھی عورتوں کے اپنے خرچ پر ہوتے ہیں۔ دو دن میں مشکل سے ایک چادر ہو پاتی ہیں۔ کسان عورتوں کا کہنا ہے کہ اگر شیشے کی قیمت نکال دی جائے تو ان کو زیادہ سے زیادہ 15 روپے بچتے ہیں۔

کھیت مزدور عورتیں کم و بیش پورے سال محنت مزدوری کرتی ہیں لیکن ان کو معاوضہ بہت کم ملتا ہے۔ ہر بدلنے والی فصل کے ساتھ ان کے معاوضے میں تبدیلی آتی ہے۔ زمیندار اپنی من پسند شرائط پر کام کرواتے ہیں۔ روزگار نہ ہونے کی وجہ سے کھیت مزدور عورتیں زمیندار کی شرائط پر کام کرنے پر مجبور ہوتی ہیں۔

جدول 1: کسان مزدور عورت کی فصل۔ سبزیوں/پھل کی کٹائی/چنائی پر اجرت

نمبر شمار	فصلیں	کل مزدور عورتیں	کٹائی	وزن	ایکڑ	وقت	ایک دن کی اجرت
1	گندم	5	کٹائی	ڈھائی من	1	چار دن	5 کلو گندم (روپے)
2	چاول	11	کٹائی + چنائی	چار من	1	دو دن	7.25 کلو چاول (روپے)
3	کپاس	1	چنائی	30 کلو (پانچ روپے کلو)	--	چھ گھنٹے	150 روپے
4	تمباکو	1	کٹائی + صفائی	---	--	سات گھنٹے	120 روپے
5	اسٹربری	1	کٹائی + چنائی + صفائی	---	--	چھ گھنٹے	120 روپے
6	آلو (ہاتھ)	1	چنائی + بھرائی	پانچ بوری	--	چھ گھنٹے	200 روپے
7	آلو (مشین)	1	بھرائی	10 بوری	--	چھ گھنٹے	150 روپے
8	مٹر (ملتان + مظفر گڑھ)	1	توڑنا + بھرنا	50 کلو (دو بوریاں)	--	چھ گھنٹے	60 روپے
9	مٹر (اوکاڑہ)	1	توڑنا + بھرنا	50 کلو	--	چھ سے سات گھنٹے	150 روپے
10	بھنڈی	1	توڑنا	20 کلو (ڈھائی روپے کلو)	--	چھ گھنٹے	50 روپے
11	کریلے	1	توڑنا	40 کلو (ڈھائی روپے کلو)	--	چھ گھنٹے	100 روپے
12	توری، کدو	1	توڑنا	--	--	چھ گھنٹے	100 روپے

کھیت مزدور عورتیں سارا سال محنت کرتی ہیں اور مختلف جسمانی، معاشی، معاشرتی اور موسمی بحران جیسی مشکلات کا مقابلہ بھی کرتی ہیں۔ کسان عورتیں کم وقت میں زیادہ سے زیادہ کام کرنے کی کوشش کرتی ہیں تا کہ زمیندار ان کے کام سے خوش رہے اور ان کو کام دیتا رہے جس کے لیے وہ اپنے شیر خوار بچے تک گھر چھوڑ کر آتی ہیں۔ روزگار کے حصول کی خاطر مزدور عورت سخت مزدوری جو کہ عام طور پر مرد کرتے ہیں جیسے گاڑی میں سبزیاں لوڈ کرنے کی مزدوری بھی کرنے کو تیار ہوتی ہے لیکن معاشرہ عورت کو اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ یہ کام کرے۔ دوسری طرف اگر مرد کام کے لیے نہ ملے تو کسان عورت یہ کام بھی کرتی ہے۔ اس صورت میں کسان عورت زیادہ وقت میں کم کام کر پاتی ہے۔ بعض اوقات کسان مزدور عورت کو کھیت مزدوری کے لیے دو دفعہ بھی آنا پڑتا ہے جیسا کہ تمباکو کی فصل میں، گو کہ محنت تو زیادہ ہوتی ہے لیکن مزدور عورت کو اجرت کم ملتی ہے۔ مختلف سبزیوں کی چنائی کے دوران کسان عورتوں کو جسمانی تکالیف بھی برداشت کرنا پڑتی ہیں جیسے اسٹرابری کی فصل میں کام کرنے سے ہاتھوں کی کھال چھل جاتی ہے، بھنڈیوں کو توڑتے ہوئے چھوٹے چھوٹے کانٹے چبھنے سے ہاتھ زخمی ہو جاتے ہیں اور چاولوں کو جھٹکنے سے پسلیوں میں درد ہونے لگتا ہے۔ گرمی میں کپاس کی فصل میں کام کرتے ہوئے دم گھٹنے لگتا ہے۔

جسمانی تکلیف کے ساتھ ساتھ معاشی مشکلات جیسے زراعت کے شعبے میں مشینری کی وجہ سے روزگار کے دورانیے میں کمی واقع ہونا ہے اور اس کے ساتھ دوسرے علاقوں سے مزدور بلانے کی وجہ سے روزگار ختم ہونا شامل ہے۔ کچے کے علاقوں میں رہی سہی کسر موسمی بحران پوری کر دیتا ہے بے وقت کی بارشوں سے چھوٹے پیمانے پر سیلاب یا ہر چھ مہینے بعد سیلاب کے پانی کی وجہ سے روزگار کے حصول میں انتہائی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان حالات میں بھی کسان مزدور عورتیں ہمت نہیں ہارتیں اور روزانہ کی بنیاد پر کشتی میں بیٹھ کر ایک جگہ سے دوسری جگہ کھیت مزدوری کے لیے جاتیں ہیں۔

اگر کسان مزدور عورت کی زندگی پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالی جائے تو معلوم ہو گا کہ چھوٹی لڑکی ماں کے کھیت چلے جانے کے بعد چھوٹے بہن بھائیوں کو سنبھالتی ہے، تھوڑی بڑی ہوتی ہے تو اسکول جانے کی عمر میں ماں کے ساتھ کھیت میں مزدوری کرنے نکل جاتی ہے، شادی کی عمر کو پہنچتی ہے تو باپ، بھائی کے کیے جانے والے ازدواجی زندگی کے متعلق فیصلے پر سر تسلیم خم کرتی ہے، شادی کے بعد شوہر، سسرال اور زندگی کے آخری ایام میں اولاد کی تابع رہتی ہے۔ اس سارے پس منظر میں کھیت مزدور عورتیں گڑیوں سے کھیلنے کی عمر سے لے کر بڑھاپے تک گھر اور گھر کے باہر چکی کے دو پاٹوں میں پستی رہتی ہیں، پر افسوس کہ ان کا نام ''کسان مزدور عورت'' کہیں نظر نہیں آتا اور نہ ہی ان کی محنت کو سراہا جاتا ہے۔ ملکی معیشت میں اہم ترین کام سرانجام دینے والی کسان مزدور عورت اب تک پزیرائی سے محروم ہے۔

یہ واضح ہے کہ جاگیرداری اور سرمایہ داری پر مبنی پیداواری نظام اور اس سے جڑا پدر شاہی نظام عورت کی معاشی و معاشرتی زندگی پر کتنا زیادہ حاوی ہے۔ پدر شاہی نظام عورتوں کے لیے تمام معاشرتی اصول بناتا ہے اور اس طرح عورت کو جاگیرداری اور سرمایہ داری کے استحصالی ہتھکنڈوں کا طابع رکھنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔

کھیتی کے کونوں، کھدروں میں
پھر اپنے لہو کی کھاد بھرو
پھر مٹی سینچو اشکوں سے
پھر اگلی رت کی فکر کرو

پھر اگلی رت کی فکر کرو
جب پھر اک بار اجڑنا ہے
اک فصل پکی تو بھر پایا
جب تک تو یہی کچھ کرنا ہے

(شاعر نامعلوم)

حوالہ جات

1۔ شریف شا، ''زراعت سے وابستہ دیہی مزدور عورتوں کی اجرت،'' جنوری تا اپریل، 2015، چیلنج، صفحہ 15، جلد 8، شمارہ 1۔

(بقیہ حوالہ جات: متبادل ایندھن: استحصال کے نئے ہتھکنڈے)

37. Oxfam. Hot and hungry - how to stop climate change derailing the fight against hunger." Oxfam Media Briefing, 25 March, 2014. Accessed from https://www.oxfam.org/sites/www.oxfam.org/files/mb-hot-hungry-food-climate-change-250314-en.pdf
38. Upton, John. "Paris talks won't achieve 2°C goal."
39. Parry, Wynne. "Living warmer: how 2 degrees will change Earth." December 8, 2010. Livescience. Accessed from http://www.livescience.com/10325-living-warmer-2-degrees-change-earth.html
40. Robert, Aline. "COP 21 agreement set to miss CO2 reduction target by 10 gigatons." 31 August, 2015, Euractiv.com. Accessed from http://www.euractiv.com/sections/climate-environment/cop-21-agreement-set-miss-co2-reduction-target-10-gigatons-317169
41. Upton, John.
42. European Commission. "The 2015 international agreement." European Commission, 2015. Accessed from http://ec.europa.eu/clima/policies/international/negotiations/future/index_en.htm
43. Harvey, Fiona. "Bonn meeting ends with last-minute comprise on Paris climate text." June 17, 2015, The Guardian. Accessed from http://www.theguardian.com/environment/2015/jun/11/sluggish-pace-mars-bonn-negotiations-on-text-for-paris-climate-deal
44. Robert, Aline. "COP 21 agreement set to miss CO2 reduction."
45. IBON International. "After Lima: hopes falter for a system-changing climate deal." December 20, 2014. IBON International. Accessed from http://iboninternational.org/tags/climate-talks

نشاۃ الثانیہ اور نوآبادیات کا امتزاج: تعلیم پر اثرات

تحریر: رابعہ وسیم

یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ بچے کی پہلی تربیت گاہ اس کی ماں کی گود ہوتی ہے۔ وہیں سے اس کی دنیا سے آشنائی ہوتی ہے۔ اس دنیا کا سامنا پہلی بار جس اجنبی ماحول میں وہ کرتا ہے اور جو کچھ وہ یہاں سیکھتا ہے وہی مستقبل میں اس کی شخصی تعمیر کا ایک کلیدی حصہ بنتا ہے۔ اس لیے درس گاہوں کا ماحول ایسا ہونا چاہیے جو طالب علم کے اندر اعتماد پیدا کرے، اس کے اندر انصاف کی چاہ کو اجاگر کرے انسانی بھلائی کے حوالے سے صحیح اور غلط پرکھنے کے علاوہ نظم و ضبط کے ساتھ ساتھ خود انحصاری، قوت فیصلہ اور آزادی رائے کو بھی پروان چڑھائے۔

بدقسمتی سے اگر ہم آج کے تعلیمی نظام پر غور کریں تو اس کا مقصد کہیں بھی واضح نہیں، سوائے اس سوچ کے کہ اپنی ذاتی زندگی کو مستقبل میں پر آسائش بنایا جائے۔ یہ خواہش ایک ایسی جنگ کی طرح نظر آتی ہیں جس میں ہر انسان دوسرے پر سبقت لے جانے کی فکر میں ہے۔ مگر یہ بات غور طلب ہے کہ آخر یہ تعلیم معاشرے کو کس روش پر لے جارہی ہے اور آج کا نوجوان کیسی تعلیم حاصل کر رہا ہے؟ اس کی تعلیم کا مقصد اس پر واضح ہے یا نہیں اور آخر وہ کونسی وجوہات ہیں جو اسے اندھا دھند ایک سمت میں لے جارہی ہیں جس کی منزل کو وہ خود بھی نہیں جانتا؟

پاکستان کا تعلیمی نظام کئی طرح کے مسائل سے گھرا ہوا ہے۔ ایک طرف تعلیم کے شعبے میں حکومت نے اپنا کردار بہت کم کردیا ہے۔ سرکاری اسکولوں کے اخراجات کے لیے بہت ہی کم حصہ قومی خزانے کی طرف سے مختص کیا جاتا ہے دوسری طرف تعلیمی شعبہ میں بڑھتی ہوئی نجکاری نے دو طرح کے تعلیمی نظام نافذ کردیے ہیں۔ انگریزی زبان میں تعلیم دینے والے اسکول اور اردو زبان میں تعلیم دینے والے اسکول۔ انگریزی میں تعلیم دینے والے اسکول و درس گاہیں عام خیال کیا جاتا ہے کہ بہتر معیار پر ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ انگریزی بولنے اور لکھنے والے بچے زیادہ ذہین اور معیاری تعلیم حاصل کرنے والے گردانے جاتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں ذہانت کا معیار ایک مخصوص زبان پر مہارت کو سمجھا جاتا ہے۔ سرکاری نظام میں بھی انگریزی پر عبور رکھنے والا طبقہ زیادہ بڑے اہم عہدوں پر تعینات نظر آتا ہے۔ ہمارے تعلیمی نظام اور دیگر معاشرے پر انگریزی زبان کا تسلط گواہی دیتا ہے کہ پاکستان کی تاریخ نوآبادیات کے اثرات سے بھری پڑی ہے۔ چونکہ ہمارا تعلیمی نظام نوآبادیات سے بہت متاثر ہوا ہے اس لیے ہم مغربی طریقہ تعلیم کی اتباع کرتے ہیں لیکن اس نقل کا کوئی خاص فائدہ نظر نہیں آتا کیونکہ پاکستانی درس گاہوں خاص کر اعلیٰ تعلیمی اداروں میں تعمیری اور تنقیدی سوچ و عمل دونوں کا فقدان واضح ہے۔

دوسری طرف مغربی سرمایہ دار دنیا میں نت نئی ایجادات کی بے تحاشہ یلغار ہے۔ یقیناً یہ ایجادات درس گاہوں میں پڑھائے جانے والے علم کا نتیجہ ہیں۔ سوال یہ اٹھتا ہے کہ اس علم سے چاہے وہ نیم جاگیردار، نیم نوآبادیاتی ممالک میں پڑھایا جارہا ہو یا جدید سرمایہ دار ممالک میں، کل انسانیت کو کتنا فائدہ ہوا؟ کیا ہم واقعی میں تعلیم یافتہ ہیں اور سارے معاشرے کو بہتری کی طرف لے جارہے ہیں؟ زیرِ نظر مضمون میں اسی حوالے سے مغرب کے تعلیمی نظام کی تاریخ پر روشنی ڈالنے کے علاوہ یہ کوشش کی گئی ہے کہ سمجھ سکیں آج کا تعلیمی نظام کس طرز کی تعلیم دے رہا ہے؟ اس تعلیم سے نہ صرف پاکستانی معاشرے بلکہ کل دنیا پر کون سا اثر ہو رہا ہے؟

علم اور مختلف ادوار

مشرقِ وسطیٰ:

علم، مصر اور بابل میں سینہ بہ سینہ، نسل در نسل منتقل ہوا۔ مختلف علوم کو سمجھنے اور مختلف معاشروں میں اسے کارگر بنانے کے لیے اور اس کی ثقافتی میراث کو مضبوط کرنے کے لیے 3,100 قبل مسیح سے لکھنے کا طریقہ اپنایا گیا۔ یہ تصویری لکھائی تھی جسے ہائروگرافی (Hierography) کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔[1] اس کے معنی خدا کے الفاظ یا مقدس الفاظ سے لیے جاتے تھے۔ اسی سوچ کی وجہ سے اس کی لکھائی سمجھنے کا حق عام آدمی کو نہیں ملا بلکہ یہ حق صرف امرا اور ان کی اولاد اور اولاد میں بھی صرف بیٹوں کو حاصل ہوا۔ اس کے علاوہ سکرائبس (Scribes) یعنی قلم کش جن کا تعلق چند امیر خاندانوں سے تھا۔ اس طبقے کو اعلیٰ درجہ نوازا جاتا تھا اور کئی مراعات حاصل تھیں۔ ان کے علاوہ اس علم کی رسائی نچلے درجے میں بھی پائی گئی ہے۔ قلم کش یا فقیہہ سے لکھائی سیکھنا ہر بچے کے لیے ممکن نہیں زیادہ تر وہ کامیاب ہوتے تھے جو پہلے سے کچھ تربیت حاصل کرچکے ہوں۔[2]

قدیم یونان: (800 قبل مسیح-146 قبل مسیح)

حالیہ مغربی تہذیب کے علم اور تعلیمی نظام کی کڑیاں قدیم یونان کے علم و تحقیق سے جڑتی ہیں۔ یونانی تاریخ میں کلاسیکی دور (Classical age) کو یونان کا سنہرا دور بھی کہتے ہیں۔ یہ وہ دور تھا جب لوگ اپنی مرضی سے ایک آزاد جمہوری زندگی گزار رہے تھے۔ مغربی تہذیب کی بنیاد بھی اسی دور کی میراث ہے۔ اس دور کا فلسفہ، ادب اور فن تقریباً ایک صدی تک لازوال رہا۔[3]

زمانہ قدیم میں علم یا تو شاہی محلات سے نکلتا یا پھر اسے گرجا گھروں میں تلاش کیا جاتا، جہاں خدا ایک ایسی طاقت تھی جس تک عام انسان کی رسائی مشکل تھی۔ یونانی خدا حقیقت سے قریب اور کم ہیبت ناک تھے اور لوگ انہیں انسانی خوبیوں سے منسلک کرتے تھے اور قدرت کی طاقتیں جیسے سورج، چاند اور سمندر کو خدا سمجھتے تھے۔ اس طرح عام آدمی کی رسائی اپنے خدا تک ہوگئی اور وہ گرجا کے اثر سے بھی باہر آ گیا۔ لوگ روحانی اور مذہبی دباؤ سے نکل کر ایک آزاد طریقہ تعلیم کی طرف آ گئے جو خداؤں اور مذاہب سے آزاد ایک الگ سوچ کے تحت اپنی صلاحیتوں پر بھروسہ کی بنیاد پر منحصر تھی۔

ان تعلیمی سرگرمیوں کے لیے سپارٹا (Sparta) اور اتھینا (Athens) آج تک مقبول ہیں۔4 اسکول نجی تھے مگر فیس کافی کم تھی جس کی وجہ سے غریب ترین بچے بھی آسانی سے پڑھ سکتے تھے۔ پانچ سال سے لے کر چودہ سال تک تمام لڑکے علم حاصل کرتے مگر امراء کے بچے اٹھارہ سال تک کی تعلیم حاصل کر سکتے تھے۔ اسکولوں میں لکھنا، پڑھنا، حساب، کے ساتھ ساتھ موسیقی، شاعری، کھیل اور جمناسٹک بھی سکھائی جاتی تھی۔ اٹھارہ سال کے بعد انہیں فلسفہ، بحث و مباحثہ اور اخلاقیات کی تعلیم دی جاتی تھی۔ دو سال کے بعد انہیں فوجی تربیت میں شامل کر لیا جاتا۔ اتھینا میں صرف حکمران طبقے کی لڑکیاں ہی تعلیم حاصل کر سکتی تھیں۔ جنہیں گھر پر ہی لکھنا پڑھنا سکھایا جاتا مگر زیادہ تر لڑکیوں کو مشین چلانا، بنائی کرنا اور دیگر گھریلو کاموں کی گھر ہی پر تربیت دی جاتی تھی۔5

ایک مخصوص طبقہ جو صوفیسٹ (Sophist) یعنی سخن ساز کہلاتا تھا، تعلیم فراہم کرنے کا ذریعہ تھا۔ سقراط سے پہلے کے زمانے، 380 قبل مسیح میں سوفیسٹ ہی اعلی تعلیم دینے کے ذمہ دار تھے۔ سوفسٹس سے علم حاصل کرنے والے زیادہ تر حکمران طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ کم از کم اتھینا میں ان کے بعد نئے طرز کی فلسفی درسگاہیں قائم ہوئیں جن کی ابتدا افلاطون جیسے فلسفیوں نے کی۔ فلسفے میں علم کے حصول میں سب سے بڑا نام سقراط (470-399 قبل مسیح) کا ہے جو کہ خیال کیا جاتا ہے کہ سوفسٹ کے زمانے میں رہے۔ سوفیسٹ کے بارے میں مانے ہوئے فلسفی سقراط، افلاطون اور ارسطو کی رائے منفی تھی۔ ان کے خیال سے سوفسٹ غلط سمجھ بوجھ کا استعمال کرتے تھے۔ یعنی دانشوری میں بے ایمانی (Fallacious Reasoning) کا استعمال کرتے تھے۔ اس زمانے میں سیاسی زندگی میں بحث و مباحثہ اور تقاریر میں مہارت ایک ضروری فن تھا جس کے ذریعہ اجلاس میں خطاب کر کے عوام کا ذہن ایک خاص نقطہ پر لایا جاتا تھا۔ سوفیسٹ اپنے طالب علموں کو بحث کے فن میں مہارت سکھاتے تھے اور ایک نقطہ کو مختلف زاویے سے بیان کرنا سکھاتے تھے۔ بحث کا مقصد سچ کو واضح کرنا نہیں تھا بلکہ اپنے نقطہ نظر کو حاوی کرنا تھا۔6 سوفیسٹ طرز تعلیم کامیابی کی نشانی سمجھی جاتی تھی کیونکہ وہ بحث و مباحثہ میں مہارت پر مبنی تھی۔ خیال کیا جاتا ہے کہ سوفیسٹ زیادہ تر اتھینا آئے کیونکہ یہاں علم کی چاہ زیادہ تھی۔ سوفسٹ اس تعلیم کی فراہمی کے بدلے اشرافیہ سے بھاری معاوضہ لیتے تھے۔7

قدیم روم

146 قبل مسیح میں یونان نے روم کو فتح کر لیا مگر یونانی طرز تعلیم کا اثر یہاں ایک صدی پہلے ہی ہو گیا تھا۔ ابتدائی تعلیم بچے اپنے باپ سے حاصل کرتے تھے۔ اگر باپ پڑھا لکھا ہوتا تو وہی اس کو قانون، رومی تاریخ اور روایات پڑھاتا تھا۔ روم میں زیادہ تر فن خطابت کو اہمیت دی جاتی تھی۔ اس دور میں یونانیوں نے کتاب بینی کا طریقہ تعلیم شروع کیا۔ چھ یا سات سال کی عمر میں ابتدائی اسکول تھا اور بارہ یا تیرہ سال کی عمر میں قوائد و زبان اسکول تھے جہاں یونانی اور لاطینی قواعد اور ادب پڑھایا جاتا تھا۔ سولہ سال کے بعد جو بچے مزید پڑھنا چاہتے تھے آگے پڑھ سکتے تھے۔8

اسکولوں میں گریڈ سسٹم پہلی صدی قبل مسیح کے وسط میں پوری رومی سلطنت میں پھیل گیا اور پانچویں صدی تک رہا۔ یونانی تعلیم کا مقصد، اچھا شہری بنانا اور ایک اچھے شہری کا مطلب ایک ہر فن مولا فرد کی تعمیر تھی۔ رومی نظام تعلیم کا مقصد بھی ایک اچھے شہری کی تعمیر ہی تھا لیکن یہاں ایک اچھے شہری کا مطلب ایک اچھا مقرر یا مباحثہ کرنے والا تھا۔ آہستہ آہستہ رومی تعلیمی نظام کافی حد تک ختم ہو گیا اور اس کے بعد خطیب صرف سینٹ (senate) تک محدود ہو گیا اور اس کو صرف شہنشاہ کی مرضی کے مطابق اپنے قلم کے استعمال کی اجازت ملی۔9

عہد وسطی: (1000 سے 1450)

سماجی لحاظ سے یہ دور دو طبقوں میں بٹا ہوا تھا، امیر اور غریب۔ غریب طبقہ میں آزاد آدمی، ہاری اور غلام شامل تھے۔ آزاد وہ جن کے پاس چھوٹے رقبے پر مبنی زمینیں تھیں اور وہ اس پر کھیتی باڑی کر کے اناج اگاتے تھے اور اسی سے گزارا کرتے تھے۔ ہاری جو کسی اور کی زمین پر کام کرتے اور اس کی زمین کی رکھوالی کرتے تھے جس کے بدلے میں اناج حاصل کرتے تھے۔ غلام، گرچہ غلام رکھنا اس دور میں غیر قانونی تھا پھر بھی لوگ غلام رکھا کرتے تھے۔ یہ تمام طبقے علم جیسی دولت حاصل کرنے سے قاصر تھے کیونکہ اس دور میں تعلیم صرف امرا کے بچوں کی میراث تھی۔ یہ وہ وقت تھا جب رومی درسگاہی نظام ختم ہو چکا تھا۔ درسگاہیں صرف خانقاہوں، گرجا گھروں اور شاہی محلات تک محدود تھیں۔10 اس دور میں قائم کردہ اسکولوں میں گرجا گھروں کا بہت اثر تھا اور یونانی اور رومی اسکولوں کے برخلاف موجودہ زندگی سے زیادہ موت، خدائی فرمان اور آخرت کے بارے میں تعلیم دی جاتی تھی۔ اسکول بچوں کو لاطینی پڑھنا سکھاتے تھے تاکہ وہ پادری کی زبان سمجھ سکیں۔ بادشاہوں کو خدائی فرمان کے پیغام رسائیوں کے طور پر مانا جاتا تھا۔11

عہد وسطی کے آخر آخر میں یونیورسٹیوں کا قیام شروع ہو گیا تھا۔ انگلستان

میں بارہویں اور تیرہویں صدی سے بہت پہلے ہی یونیورسٹیوں کا آغاز ہو چکا تھا، اس کی ایک مثال انگلستان کی آکسفورڈ یونیورسٹی ہے، یونیورسٹی آف پیرس اور یونیورسٹی آف بالونہ (اٹلی) بھی اس ہی دور کی یونیورسٹیاں ہیں۔ یونیورسٹی میں طلبہ آرٹس کی ڈگری حاصل کرنے کے لیے سات لبرل آرٹس کے مضمون پڑھتے تھے جن میں علم ہندسہ، فلکیات اور موسیمیات شامل تھے۔ اس دوران عورتوں کی تعلیم کو بھی اہمیت ملی، ان کی تعداد کم تھی مگر آغاز ہو گیا تھا۔[12]

تیرہویں صدی میں دینی، اخلاقی اور سماجی ضابطہ و روایات پر مبنی تعلیم جو جرات اور شجاعت کا نشان سمجھی جاتی تھی اور ثانوی تعلیم کی حیثیت رکھتی تھی بہت عام تھی۔ جس میں زیادہ تر تاجر یا سورما (knights) نوجوان صاحب حیثیت افراد کے گھر یا بادشاہ کے محل (کورٹ) میں قیام کرتے تھے اور شاعری، قومی تاریخ، تمیز و طریقہ، جسمانی تربیت، ناچ گانا اور جنگی مشقیں سیکھا کرتے تھے۔ غریب طبقے کے بچے مختلف ہنر کی تربیت حاصل کرتے تھے۔ اس دور کی غریب طبقے کی لڑکی کے لیے تعلیم حاصل کرنا تقریباً ناممکن تھا۔ صرف اعلی طبقے کی کچھ عورتیں تعلیم حاصل کرتی تھیں، جن کے لیے گرجا گھر یہ فیصلہ کرتے تھے کہ وہ کون سی تعلیم حاصل کریں گی۔[13]

عہد وسطی میں عام لوگوں کی رسائی تعلیم تک نہیں تھی، لیکن ہنر سیکھنے کے عمل میں یہ طبقہ بہت آگے تھا۔ مختلف گروہوں میں ہنر سکھائے جاتے تھے جنھیں گلڈز (guilds) کہا جاتا تھا۔ جاگیردارانہ نظام میں صاحب اختیار لوگ جیسے کہ جاگیرداروں کے ملازم اور سورما ہاریوں اور بے زمین کسانوں سے کرایہ اور محصول لیا کرتے تھے جس کو ادا کرنا کافی مشکل ہوتا تھا۔ ایسے موقعوں پر گلڈ کا ممبر ہونا فائدہ مند ثابت ہوتا کیونکہ اس سے ملنے والی رقم سے لوگ محصول ادا کر پاتے تھے۔[14]

گلڈز میں کام کرنے والے تین مراحل سے گزرتے تھے۔ اپرینٹس (apprentice) یعنی زیر تربیت ملازم جو سات سال کے لیے تربیت اور ہنر سیکھتے تھے، ان میں اکثریت نوجوان لڑکوں کی ہوتی تھی۔ دوسرا درجہ جرنی مین (journey men) کا ہوتا تھا جس میں ہنر سیکھنے والے جرنی مین کو اپنے ہنر اور وفاداری کو ثابت کرنا ہوتا تھا۔ اس دوران کم از کم تین سال تجارتی دورے پر رہنا اور ایسی مثالی اشیاء (master piece) تیار کرنی ہوتی تھی جو کام سکھانے والے یعنی استاد کو پسند آجائے۔ اگر استاد کام کو منظور کر لیتا تو شاگرد اپنا تربیتی گروہ شروع کر سکتا تھا۔ آخری درجہ ماسٹر (master) یعنی استاد کا تھا جو اپنے گروہ کو ہنر سکھاتا تھا اور گلڈ میں سارے اختیارات اسی کے پاس ہوتے تھے۔ گلڈز کام کرنے والے لوگوں کو مختلف سہولیات فراہم کرتی تھی، ہنر سیکھنے کے ساتھ ساتھ اگر کام کرنے والے شخص کے ساتھ کوئی حادثہ ہو جائے تو کفن دفن، بچوں اور معذوروں کی دیکھ بھال بھی گلڈ ہی کا ذمہ تھی۔ اس کے علاوہ تجارتی دورے پہ جانے والے افراد کی زمین کی دیکھ بھال بھی ان ہی گلڈز کی ذمہ داری ہوتی تھی۔[15]

ان گلڈز میں نان بائی، راج مستری، مصور یا نقاش، بڑھئی، ترخان، موچی، کپڑے بنانے والے، موم بتی اور اونس ناپنے کے ہنر کی تربیت شامل تھی۔[16] اس وقت کی اہم ایجادات میں ریت گھڑی (hour glass)، چھاپہ خانہ (printing press) اور عینک بھی شامل ہیں۔ اس کے علاوہ پہیے کا استعمال بھی اسی دور میں بڑھا۔[17]

عہد وسطی میں کلیساؤں کے اکسانے پر (تجارتی راہداری کی کشیدگی پر) ہونے والی صلیبی جنگوں کی وجہ سے یورپ میں بڑے پیمانے پر تباہی آئی۔ ان جنگوں کے علاوہ 1400 صدی سے طاعون کا شدید حملہ دیکھنے میں آیا جس کو کالی موت (بلیک ڈیتھ) کا نام دیا گیا اور خیال کیا جاتا ہے کہ اس سے تقریباً 75 ملین (7 کروڑ 50 لاکھ) افراد ہلاک ہوئے جس نے غریب اور مزدور طبقے کو تقریباً ختم ہی کر دیا۔[18] جہاں طاعون نے مزدور طبقے پر حملہ کیا وہیں پر اساتذہ بھی بڑی تعداد میں موت کا شکار ہوئے۔ کئی اسکول اساتذہ کی اموات کی وجہ سے بند ہو گئے۔[19]

اتنی بڑی تعداد میں اموات نے جاگیردارانہ نظام کو بہت نقصان پہنچایا، مزدور کی مانگ بڑھ گئی اور جاگیردار اپنے ہی ہاریوں کو پیسے کے بدلے مزدور رکھنے پر مجبور ہو گئے۔[20]

ان دو تباہیوں (یعنی کالی موت اور جنگوں) نے یورپ میں ایک بہت بڑی معاشرتی تبدیلی پیدا کی۔ لوگوں کا گرجا گھروں پر ایمان کمزور پڑ گیا۔ بادشاہت کی طاقت بھی کالی موت سے مقابلہ کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی تھی۔ اس طرح روایتی طاقتوں کے اختیار اور رتبے میں بہت کمی واقع ہوئی۔ کاروباری طبقہ کو بہت تقویت حاصل ہوئی اور گلڈز کے پرانے طریقے ختم ہونے لگے عہد وسطی سے نکل کر معاشرہ اب رینا سانس یعنی نشاۃ الثانیہ کی طرف چل پڑا۔ یہی وہ وقت تھا جب یورپ میں جاگیردارانہ نظام کی جگہ سرمایہ داری نے لینا شروع کی۔[21]

نشاۃ الثانیہ: (Renaissance 1330-1550)

لفظ رینا سانس کا مطلب ہے نئی پیدائش اور یہی اس دور کا سب سے اہم جز سمجھا جاتا ہے۔ اس دور کی خاصیت تعلیمی و ذہنی نظریے میں ایک بہت بڑی تبدیلی ہے جس کے تحت تحقیق و تعلیم کے نئے زاویے اپنائے گئے۔ اس کو عام طور سے ہیومنسٹ تعلیمی اصلاح کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس دور میں کلاسیکل ذرائع (یعنی ارسطو اور افلاطون کی لکھائی) سے تعلیم حاصل کرنے کا رواج بڑھا اور ثبوت اور عقل و فہم کی بنیاد پر تحقیق پر زور دیا گیا۔[22] گرجا گھروں کے طریقہ کار جو کے خدائی فرمان کو ریاست پر کل اختیار دیتا تھا کو بھی للکارا۔[23] رینا سانس کا آغاز اٹلی میں 1300 میں ہوا اور 1500 تک یہ پورے یورپ میں پھیل گیا۔ اس دور میں چھاپے خانے نے تعلیمی شرح میں بے پناہ اضافہ کیا۔ جیسے جیسے اس کا استعمال بڑھا انقلابی خیالات کا طوفان امنڈتا رہا۔ اس دور میں یورپ میں تقریباً 63 مزید یونیورسٹیوں کا قیام ہوا۔[24]

ان ساری تبدیلیوں کے ساتھ یہ بھی بتانا ضروری ہے کہ اس دور کی ہیومنسٹ طرزِ تعلیم غریب طبقے تک نہیں پہنچی۔ وہ اس سوچ سے بے خبر ہی رہے۔[25]

بہرحال دنیا کی سوچ تبدیل ہورہی تھی اور لوگ مذہبی تسلط سے نکل کر ہیومنسٹ نظریہ اپنا رہے تھے۔ اس نئے نظریہ نے تحقیق اور تجزیہ پر شدید اثر ڈالا اور نتیجے میں آنے والی صدیوں میں سائنسی انقلاب برپا ہوا۔[26]

یورپی تاریخ لکھنے والوں کا خیال ہے کہ صنعتی انقلاب کے فوائد اس سے پہلے آنے والی ساری تبدیلیوں جس میں رینا سانس، ریفارمیشن، سائنسی انقلاب یا پھر روشن خیالی کا دور سب شامل ہیں، سے کہیں زیادہ ہے۔ صنعتی انقلاب نے قدرت پر قابو پانے کی کوشش کی۔ یہ سوچ جدید سائنس کے بانی فرانسس بیکن نے دی تھی۔ فرانسس بیکن کا خیال تھا کہ فلسفۂ قدرت (natural philosophy) جو کہ آج سائنس کہلاتا ہے کو مسائل حل کرنے کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ بیکن کے خیال میں انسان اس وقت آزادی حاصل کرسکتا ہے کہ جب وہ مستقل مشقت سے آزاد ہوجائے جو کہ مشینوں کے ذریعے ہی ممکن تھا۔ اس طرح جدید ٹیکنالوجی کی سوچ پیدا ہوئی۔ بیکن کے خیال سے علم طاقت تھا اور سائنسی علم قدرت کے اوپر حاوی ہوسکتا تھا۔[27] سائنس کے استعمال سے نئی تکنیکی ایجادات تاریخ کو لے کر آگے چلے گی۔[28] اس مقام پر پہنچ کر ایک ایسے نظام کی ضرورت تھی جو انسان کو مشین کے ساتھ مستقل طور پر جوڑ سکے تاکہ وہ انسانی ترقی کو فروغ دے اور آگے بڑھ سکے۔ فرانسس بیکن کا سائنٹفک رئلازم یہاں پر بڑے پیمانے پر پروان چڑھا اور بادشاہی دور کی وہ باتیں جن میں بادشاہ کو گویا خدا کا نائب سمجھنے کی نفی ہوئی۔[29]

فرانسس بیکن جو رینا سانس دور کے ایک فلسفی اور ماہر سیاست تھے نے علم کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے، خدائی اور قدرتی۔ انسان کے پاس خدائی علم خدائی الہام سے آتا ہے، جب کہ دوسری طرف قدرتی علم مادی امور سے حاصل ہوتا ہے جو انسان اپنے اردگرد کی دنیا سے عملی تجربات کے ذریعے حاصل کرتا ہے۔ یہ نئی طرزِ سوچ بھی ہیومنسٹ نظریہ کا حصہ تھی۔ نئی ایجادات اور معیشت کے بڑھاوے نے یورپ کی قوموں کو ترقی کے ایک نئے دہانے تک پہنچا دیا اور عہدِ وسطیٰ کے فرسودہ خیالات کی نفی ہوئی۔ فرانسس بیکن کو اس وقت کے بادشاہ نے سر کا خطاب دیتے ہوئے کئی اعلیٰ درجہ جات سے نوازا یہ برطانیہ کے مانے ہوئے سیاست دان اور اشرافیہ کے خاندان کے تعلق رکھتے تھے۔ بیکن نے خاص کر کے یہ خیالات پھیلائے کہ ''بادشاہ کا یہ خاص اخلاقی فرض ہے کہ وہ اپنی سلطنت کو نا صرف قائم رکھے بلکہ اس کی حدوں کو مزید بڑھائے''۔[30]

صنعتی ترقی

رینا سانس کے تحت آنے والی سائنسی ترقی اور صنعتی ترقی کے دور پر آج شدید تنقید پائی جاتی ہے۔ مثلاً سینڈرا ہارڈنگ (Sandra Harding) جو فلسفے کی پروفیسر ہیں کا کہنا ہے کہ جہاں سائنسی علوم نے انسان کو بادشاہی اور گرجا نظام سے آزاد کیا وہیں ان کی جگہ اس نئے سائنسی طریقہ کار نے سرمایہ دار کو دے دی۔[31] اگر ہم اس نئی سوچ پر مبنی ''ریشنل سائنس'' کے انسانیت پر اثرات پر سوال اٹھائیں تو یہ ہمیں ترقی کے خلاف اور اسے ایک انتہا پسند رجحان کہیں گے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ سائنس لوگوں کو فائدہ دینے کے بجائے انہیں طبقات میں تقسیم کرنے کی وجہ بن رہا ہے مگر افسوس کی بات یہ ہے کہ اسے مقدس بنا کر ہر سوال سے آزاد کردیا گیا ہے۔[32]

ہارڈنگ نے اپنی کتاب ''دی سائنس کوئسچن ان فیمنزم (The Science Question in Feminism) میں طبقہ، سائنس کے مقدس مقام اور عورتوں کے سائنسی علوم سے باہر رکھے جانے پر تنقید کی ہے۔ سائنسی ترقی کے حوالے سے انہوں نے تین سوالات پیش کیے ہیں جن کا سہارا انہوں نے اپنی تنقید کو سمجھانے کے لیے لیا ہے:[33]

1۔ آج کے زمانے میں طبعیات (فزکس) کا سماجی بہبود سے کوئی تعلق نہیں، سماجی بہبود کے لیے اخلاقی اور سیاسی ناانصافی، قدرت کے قانون کو نہ جاننے سے کہیں زیادہ بڑی رکاوٹ ہے۔

2۔ طبقاتی نظام میں سائنس کی وجہ سے سماجی تفریق میں اضافہ ہوتا ہے۔

3۔ اگرچہ انفرادی سائنسدان بڑے بڑے ذاتی مقاصد اور معاشرتی خیالات رکھتے ہوں لیکن اگر ان کی موجودہ کارگردگی کا جائزہ لیا جائے تو در اصل وہ چند افراد کے منافع میں اضافہ اور ان ہی افراد کا ایک بہت بڑی عوام پر سماجی قبضے کے لیے کام کرتے نظر آئیں گے۔

وہ بیکن کے خیالات پر تنقید کرتے ہوئے کہتی ہیں کہ بیکن کا خیال تھا کہ ٹیکنالوجی اور مشین سب انسانوں کو برابر کردے گی۔ اگر ایسا ہی ہے تو پھر اعلیٰ افسر اور مزدور طبقہ کیوں ہے؟ مزید یہ اگر مشین سب کے ہنر کو برابر کرنے والی تھی تو کم درجہ، کم اجرت کے شعبوں میں عورتوں کی تعداد مردوں سے کہیں زیادہ کیوں ہے؟[34]

دیکھنے میں آیا ہے کہ سائنسی طریقہ تعلیم نے طالب علموں کو دو عام طبقات میں تقسیم کردیا، ہنرمند اور غیر ہنرمند کام کرنے والے، اسی طرح تعلیم کو بھی تقسیم کردیا گیا جن میں ہنرمند طالب علم صنعتوں کے پیداواری انتظام سے اور کم ہنرمند طالب علم فنی/ٹیکنیکل شعبے سے منسلک ہوگئے۔ جس میں ایک نظام نے لوگوں کو مزدوری کرنے کے لیے تیار کیا اور دوسرے نے لوگوں کو مزدوری لینے والا یا مزدوروں سے کام لینے والا بنا دیا۔ اب صنعتوں کو چلانے کے لیے ایک جیسے لوگوں کی ضرورت نہیں تھی۔[35] اس حوالے سے سرمایہ داری ایک نیا نظام سامنے لائی جس میں مزدور مینجمنٹ یا انتظامیہ کے ہاتھوں میں آگئے اور سائنٹفک مینجمنٹ (Scientific Management) کا آغاز ہوا جسے ٹیلریزم (Taylorism) کہتے ہیں۔[36]

ہنر مند طبقہ کے لیے کیا سوچا گیا؟ اس کا اندازہ ہم سرمایہ داری نظام کے ایک بڑے دلدادہ ولیم ای ویکین ڈن کی یونیورسٹی سے متعلق اس اقتباس سے اخذ کرسکتے ہیں:37

''لفظ یونیورسٹی لاطینی زبان کا لفظ ہے۔ جس کے معنی ہیں کارپوریشن۔ کالج ہاسٹل یا کالج میں رہائش گاہ محض گلڈز کا تسلسل ہے جس میں استاد کام کرنے والوں کو نہ صرف تربیت دیا کرتے تھے بلکہ انہیں رہنے کے لیے گھر بھی مہیا کرتے تھے۔ یہاں سے ہمارا دائرہ کار شروع ہوا... مگر جیسے جیسے یہ دائرہ وسیع ہوا تعلیمی دنیا صنعت کی دنیا سے دور ہوگئی۔ سوربون اور آکسفورڈ کو سائنسی دنیا اور صنعتی دنیا کا قطعاً علم نہیں تھا اور وہ اسے حقیر سمجھتے تھے لیکن دونوں دائرے جھولتے رہے اور صنعت اور تعلیم قریب تر ہوتے چلے گئے۔ آج تک یہ ایک دوسرے سے قریب آرہے ہیں اور یہ ایک ایسے مقام پر جلد پہنچ جائیں گے جہاں کارپوریشن اور تعلیم ایک ہو جائیں گے اور کارپوریشن اور یونیورسٹی کا پھر سے ایک مفہوم ہوگا''۔

ویکین ڈن جن کا انجینئرنگ کی تعلیم کے ساتھ ایک گہرا تعلق تھا اور انہوں نے تعلیم کے اس شعبہ کو تیکنیکی کارکردگی سے جوڑنے میں کلیدی کردار ادا کیا۔ ویکین ڈن نے امریکہ میں کارپوریٹ شعبہ کو پروان چڑھانے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ان کا کہنا تھا کہ انجینئرنگ کے طالب علموں کو ''ذاتی اہلیت کی بنا پر زندگی میں آگے بڑھنا چاہیے نہ کہ عوامی تحریک کے ساتھ جڑ کر''۔38

ولیم ای ویکین ڈن سے ملی یونیورسٹی کے اقتباس سے سمجھ میں آتا ہے آج کے دور کی یونیورسٹیوں کا قیام درحقیقت مختلف صنعتوں کو فروغ دینا ہے اور اس کا مقصد ایک خاص سوچ اور تربیت میں پروان چڑھے طبقات میں بٹے ایسے ربورٹ نما انسانوں کو معاشرے سے متعارف کرانا تھا جو قدرتی حقائق سے زیادہ مشینی تجربات پر انحصار و بھروسہ کریں۔

اسی طرح سائنس اور سرمایہ داری پر ایک مصنف ڈیوڈ ایف نوبل نے بھی تنقید کرتے ہوئے سرمایہ داری اور تعلیم کے ملاپ کی وجہ سے ہونے والے نقصانات واضح کیے ہیں۔ ان کے مطابق سرمایہ داری نے انسانی زندگی پر بہت منفی اثرات ڈالے ہیں:39

1۔ سائنس کو معاشرے سے الگ کرنا: ٹیکنالوجی جو انسان کی طابع تھی اسے پہلے تو انسان سے الگ کیا گیا اور پھر اسے انسان سے زیادہ اہمیت دینی شروع کردی گئی، جس کی وجہ سے انسان کی اہمیت کم ہوگئی۔

2۔ ٹیکنالوجی کا فروغ: صنعتوں میں ٹیکنالوجی کے فروغ نے افراد کو ایک پیداواری رشتے ''مالک اور مزدور'' میں باندھ دیا مگر جیسے جیسے یہ پیداوار بڑھی اس کا فائدہ صرف مالک کو ہوا جس کی بنیاد پر مزدور اور مالک کے رشتے میں کھچاؤ بڑھنا شروع ہوا۔ یہاں مزدور کو صرف پیداوار بڑھانے کا ایک آلہ کار سمجھا گیا۔ یہ چند افراد کا عوام پر استحصال تھا۔

3۔ تعلیم پر کنٹرول: سرمایہ داروں کو صنعتوں کے لیے بڑی تعداد میں تربیت یافتہ افراد کی ضرورت تھی لہذا تعلیمی نظام پر اپنی اجارہ داری قائم کرنے کے لیے سرمایہ داروں نے اس شعبے میں منظور شدہ پیشہ ورانہ انجینئرنگ کا آغاز کیا۔

موجودہ تعلیمی نظام پر نظر ڈالیں تو واضح ہوگا کہ اس کی جڑیں بہت پرانی نہیں، انیسوی صدی سے پہلے اسکول اور کالج مذہبی اور قدیم ادب سے وابستہ تھے۔ تیکنیکی تعلیم کو حقارت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا، طاقتور صنعتکاروں اور چند سائنس دانوں کے دباؤ میں آکر ٹیکنیکل کالجز اور اداروں کا آغاز ہوا تاکہ صنعتوں کو فروغ مل سکے اور نہ صرف چند افراد بلکہ ایک پوری نسل تیار ہوسکے جو مختلف اندرونی تعمیری منصوبوں، جیسے نہری نظام، ریل سڑک کی تعمیر اور سائنسی صنعتوں میں معاون ثابت ہو۔ مثال کے طور پر ایک کیمسٹ ایبن ہارس فورڈ نے برطانیہ کے ایک صنعتکار پر زور دیا کہ وہ ہارورڈ کو سائنسی تعلیم کے لیے 50,000 ڈالر کی امداد دے تاکہ وہ الگ سے فنی/ٹیکنیکل تعلیم کے لیے ایک نیا لارنس سائنٹفک نامی اسکول کھول سکے۔40

اس حوالے سے جیک کلوپن برگ بھی لکھتے ہیں کہ سرمایہ دارانہ نظام میں یونیورسٹیوں کو بڑی تعداد میں امداد دے کر سرمایہ دارانہ نظام کا طابع بنایا جارہا ہے۔ بائیوٹیکنالوجی کمپنیوں نے اساتذہ کو اپنی تحقیق میں شامل کرنے کے لیے اپنے اداروں میں آنے کے مواقع فراہم کیے مگر اکثر اساتذہ نے یونیورسٹی چھوڑنے سے انکار کردیا۔ کیونکہ اساتذہ مکمل سرمایہ دار اداروں میں جانے سے ہچکچاتے ہیں۔ اس کا حل ان کمپنیوں نے یہ نکالا کہ صنعتوں کی طرف سے اعلی تعلیم کے لیے ملنے والی امداد تین سے چار فیصد سے بڑھا کر یونیورسٹیوں میں بائیوٹیکنالوجی تحقیق پر 16 سے 24 فیصد تک کردی۔41 اب یونیورسٹیوں میں ہونے والی تحقیق پر سرمایہ دار بائیوٹیکنالوجی کمپنیوں کا اثر رسوخ بہت بڑھ گیا۔

یہاں اس بات کو سمجھنا انتہائی ضروری ہو جاتا ہے کہ صنعت کاروں کا مقصد سچائی کی تحقیق و تلاش یا عوامی فلاح نہیں تھا بلکہ ایسی انسانی مشینوں کو تیار کرنا تھا جو ان کے کاروبار اور دولت کو بڑھاسکیں اور ان کی ذاتی ترقی کی راہ میں حائل رکاوٹوں کو دور کرسکیں اور حقائق پر پردہ ڈالے رکھیں۔

اس حوالے سے نوبل نے معاشرے میں ٹیکنالوجی کے کردار پر بہت اہم نکات اٹھائے ہیں۔ نوبل کہتے ہیں کہ ''ٹیکنالوجی انسانی تاریخ میں صرف ایک آگے بڑھانے والی طاقت نہیں گو کہ اس کو صحیح طور پر بیان کیا جاسکتا ہے کہ ٹیکنالوجی کئی عوامل کا ملاپ ہے جن میں شامل ہے جمع کردہ سائنسی علم و تکنیکی ہنر، آلہ جات، دلائل پر مبنی سوچنے سمجھنے کی عادات، انسانوں کی مادی پیداوار لیکن ٹیکنالوجی ان سب عوامل سے زیادہ گھمبیر ہے''۔42

نوبل کے مطابق ٹیکنالوجی بذات خود انسان ہے جو کہ ایک مخصوص معاشرتی اور تاریخی پس منظر میں کام کررہا ہوتا ہے۔ نوبل دیگر دلائل دیتے ہوئے اس نکتے پر

زور دیتے ہیں کہ ٹیکنالوجی صرف ایک آلہ کار نہیں جس کو انسان بناتے اور استعمال کرتے ہیں بلکہ انسانوں ہی میں سے مخصوص معاشرتی گروہوں کا ٹولہ اس کے مخصوص استعمال کا رخ متعین کرتا ہے۔ یہ وہ طاقت ور اثر رسوخ رکھنے والا طبقہ ہے جو اس ٹیکنالوجی سے جانبدارانہ فوائد اٹھانا چاہتا ہے۔ اس طرح ٹیکنالوجی ایک ایسا آلہ کار ہے جس کے ذریعہ معاشرتی ترقی کے لیے کسی مخصوص راستے کا تعین کیا جاسکتا ہے جو کہ ایک خاص طبقہ کا اپنے مفاد پر مبنی چنا ہوا راستہ ہے۔43

ٹیکنالوجی پر کلوپن برگ کا کہنا ہے کہ ''سائنسی ایجادات اب کاروبار بن گئیں ہیں یہی وہ خاص تبدیلی ہے یعنی آج کی سرمایہ داری نظام کی تکنیکی بنیاد جو کہ اس کو اپنی پچھلی شکلوں سے الگ کرتی ہے''۔ اس حوالے سے کلوپن برگ بریورمین کے اقتباس کو پیش کرتے ہیں کہ ''اگر ہم انیسویں صدی کے صنعتی انقلاب کا بیسوی صدی کی سائنسی تکنیکی انقلاب سے موازنہ کریں تو پہلے سائنس ایک عمومی معاشرتی ملکیت تھی جو پیداوار میں اتفاقیہ کام آتی تھی جب کہ اب تبدیل ہوکر سرمایہ داری کی ملکیت بن گئی ہے اور پیداوار کا ایک اہم جز بن گئی ہے''۔ کلوپن برگ کا کہنا ہے کہ سرمایہ داری نے سائنس کو ایک ایسا آلہ کار بنایا ہے جس سے وہ دنیا کو ہلا سکتا ہے۔ جیسے جیسے صنعتی انقلاب میں ٹیکنالوجی کے استعمال کے دیگر طریقے سمجھ آنے لگے اور ساتھ ساتھ سرمایہ داری میں بھی پختگی آئی تو اپنے منافع کمانے کی رفتار کو برقرار رکھنے کے لیے سائنس کا رخ کیا۔44 اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام نے صرف ایک مخصوص طبقے کو فائدہ پہنچایا اور معاشرے کے باقی افراد کو صرف اس نظام کا حصہ بنایا اور ان کے صنعتی کام کے حوالے سے ان میں طبقاتی تقسیم کردی۔ لیکن سب سے خطرناک عمل سرمایہ دارانہ نظام میں علم کی شمولیت تھی۔

اگر آج کے تعلیمی نظام پر غور کریں تو یہ بات آسانی سے سمجھ میں آجائے گی کہ سرمایہ دار نے صرف ان مضامین کی تعلیم پر سرمایہ لگایا جن کے بڑھ جانے سے ان کے کاروبار کو تقویت مل سکے۔ ان مضامین میں بالترتیب فزکس، کیمسٹری اور بائیولوجی جیسے مضامین پر سب سے زیادہ اور اس کے بعد جغرافیہ اور حساب کو فوقیت دی گئی مگر انسانیت پر مبنی تعلیم جیسے فلسفہ، تاریخ سماجی بہبود، اخلاقیات وغیرہ کو یکسر نظر انداز کیا گیا۔ یہ وہ تعلیمات تھیں جو انسانیت کا درس دیتی ہیں، جیسے فلسفہ ایک جامع سوچ کی طرف لے جاتا ہے اور انسان دیگر عوامل کا تنقیدی جائزہ لے کر وجوہات کی کھوج کرتا ہے جس سے انسان کو مختلف مسائل کے حل تلاش کرنے آسان ہو جاتے ہیں۔45

ہارورڈ یونیورسٹی کی ایک رپورٹ ''میپنگ دی فیوچر'' (Mapping the Future) کے مطابق 1966 سے 2010 تک ہیومینیٹیز (Humanatis) کے طالب علموں کی تعداد تقریباً آدھی ہو چکی ہے۔ ماہندرا ہیومینٹس سینٹر کے پروفیسر ہومی کے بھابھا (Homi K. Bhabha) کے مطابق ترقی یافتہ اور ترقی پزیر دونوں ممالک میں ہیومینیٹیس کو سنجیدہ مسائل کا سامنا ہے۔ یہ تعلیم اس لیے ضروری ہے کہ یہ مساوات اور فلاح و بہبود کے نظریے کو فروغ اور معیار زندگی پر سوالات اٹھاتی ہے۔46

اس نظام نے زندگی کے دوسرے شعبوں کے ساتھ ساتھ تعلیمی نظام کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ سرمایہ دارانہ نظام کا مقصد سرمایہ کمانا، مقابلہ کرنا اور دوسروں سے آگے نکلنا ہے۔ یہی وہ قدریں ہیں جو سرمایہ داری نظام کی بنیاد ہیں اور جو وہ تعلیمی نظام میں پروان چڑھا رہے ہیں۔ اس طرح پوری دنیا ہی ایسے طرز زندگی کی طرف چل پڑی جہاں مفاد پرستی زندگی کا سب سے پہلا اصول بن گیا۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ اس وقت ہم ایک نئے معاشرے میں قدم رکھ رہے ہیں یا رکھ چکے ہیں جو دور جدید کی نمائندگی کررہا ہے۔ اس دور میں انسان کی جگہ مشین لے رہی ہے۔ اس مشین پر مبنی صنعتی ترقی نے آج معاشرے کو کون کون سے تحفے عطا کیے ہیں؟

مشینی زندگی نے ایک طرف ایک چھوٹی سی آبادی کو بے تحاشہ دولت پر تعیش زندگی تو نوازی لیکن دنیا کی ایک بھاری اکثریت کو بے روزگاری، غربت اور بھوک سے ہمکنار کیا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام نے نہ صرف انسان بلکہ ماحول کو بھی بہت سے نقصان پہنچائے ہیں جس کی وجہ سے موسمی بحران بہت بڑھ گیا ہے۔ جتنی تیزی سے صنعتی پیداور بڑھی اور رکازی ایندھن کے استعمال سے کاربن گیسز کا ماحول میں اضافہ ہوا، اتنی ہی تیزی سے زمین کا درجہ حرارت بڑھا جس کی وجہ صنعتوں سے، ٹرکوں، جہاز اور گاڑیوں سے نکلنے والا دھواں ہے اور اس کے علاوہ سرمایہ داری کی جانب سے استعمال ہونے والے ہتھیار سے خارج ہونے والی گرین ہاؤس گیسیس کئی طرح کی تباہیاں برپا کرتی ہیں۔ صنعتی انقلاب کے بعد گزرے ہوئے سو سال میں بڑھتی ہوئی گرمی کی وجہ سے سمندر کی سطح 10-25 سینٹی میٹر بڑھ گئی ہے اور صدیوں سے موجود گلیشیر پگھلنے لگے ہیں جو پوری دنیا میں مختلف تباہ کاریوں کی وجہ ہیں۔ ان موسمی تبدیلیوں کا سب سے زیادہ نقصان غریب ترین ممالک کو بھی ہورہا ہے جہاں دراصل صنعتیں بہت کم ہیں۔47

جیسا کہ پہلے لکھا گیا آج تعلیم کی پسماندگی اور مخصوص طبقوں کی اجارہ داری میں نو آبادیات کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ اس حوالے سے اس پہلو پر نظر ثانی بہت ضروری ہے۔

رینا سانس کے تحت یورپ کے روشن خیال دور میں نئی آبادیاں دریافت ہوئیں۔ نوآبادیات کے تحت یورپ نے دریافت شدہ ممالک سے بہت فائدہ اٹھایا۔ امریکہ سے نہ صرف وسائل چوری کیے بلکہ وہاں اپنی آبادیاں بنائیں اور عیسائی مذہب کو فروغ دیا۔ 1575 میں جہاں ان کے ممالک میں صنعتیں بن رہیں تھیں، وہاں خام مال اور مزدور کی اشد ضرورت تھی۔ سرمایہ دارانہ نظام کا آغاز ہو چکا تھا، صنعتی انقلاب کے نتیجے میں بننے والے اس نظام کو تقویت دینے کے لیے صنعتوں کا مفاد سامنے رکھتے ہوئے نئے انداز کی یونیورسٹیاں تشکیل دی جانے لگیں۔48 برطانیہ نے ہندوستان اور افریقہ پر قدم جمائے اور وہاں سے خام مال اور غلام حاصل کیے۔ جہاں ایک طرف یورپ کے لوگ شخصی آزادی کے گن گاتے نظر آئے وہیں دوسری طرف ان ہی کے کالی

چمڑی والے غلام، بے انتہا تکلیف میں کوڑیوں کے مول کام کرتے نظر آئے۔ اس دور میں ہندوستان برطانوی راج کی نوآبادیات بن گیا۔ اس کی تہذیب کو نقصان پہنچایا اور خام مال اور سستے مزدور حاصل کرنے کے لیے بہت بڑے پیمانے پر ہندوستان کی دولت اور اثاثوں پر انگریز نے زبردستی قبضہ کرلیا۔ یہ وہ وقت تھا جب برصغیر کو دنیا کا ورک شاپ کہا جاتا تھا جہاں دنیا کی تقریباً ایک چوتھائی مصنوعات تیار ہوتی تھیں۔49 یعنی یورپ میں آنے والے رینا سانس و سائنسی انقلاب اور پھر صنعتی انقلاب نے دنیا کے کئی حصوں کو بری طرح پامال کیا۔ برطانیہ کے قبضے کے بعد 1750 سے 1947 تک ہندوستان کی معیشت کو کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ جبکہ اس کی کمائی پچاس فیصد تک کم ہوگئی۔ اس تمام عرصے میں کسی قسم کی معاشی ترقی نہیں ہوئی۔50

یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ نوآبادیت تیسری دنیا کے ممالک کے لیے ایک سیاہ دور تھا۔ اس روشن خیال معاشرے نے برصغیر پر جاگیرداری نظام کے گہرے ستون گاڑھ کر آج تک تباہی کے راستے پر ڈالا ہوا ہے۔

پاکستان میں انگریزی تعلیم کا فروغ

برطانوی راج کی اس اندہ ناک روش کو انیسویں صدی کے حب الوطن نے ایک ترقی کا ایک تضحیک آمیز دور قرار دیا ہے اور اس دور میں ہونے والی ترقی کو برطانیہ کی ترقی اور ہندوستان کی تباہی قرار دیا ہے۔ معاشی بلکہ نفسیاتی طور پر بھی انگریز نے اس خطے کے لوگوں پر اپنا قبضہ جما لیا اور نہ صرف ان سے خودمختاری چھینی بلکہ احساس کمتری میں بھی مبتلا کردیا۔ ایسے طریقے متعارف کرائے گئے کہ یہاں کی آبادیاں ذہنی طور پر مفلوج ہو جائیں اور ان کے ہاتھ سے ہنر چھین کر انہیں ایک ایسے طریقہ تعلیم سے روشناس کرایا جو عہد وسطیٰ کی طرح سخت دباؤ اور نظم و ضبط پر مبنی تھا۔

ایک بے جان تعلیمی نظام کے ساتھ ساتھ انہوں نے ہمیں ایک تحفہ اور بھی دیا۔ برطانوی راج نے یہ ضرورت محسوس کی کہ ہندوستانیوں کو انگریزی تعلیم سے اپنے خیالات اور برطانوی ثقافت کا غلام بنایا جائے۔ لورڈ مکولے کے ان مشہور الفاظ سے انگریزوں کی اس سوچ کو بہ آسانی سمجھا جاسکتا ہے۔ ''انگریزی تعلیم کے ذریعے ہم ایک ایسا طبقہ بنانا چاہتے ہیں کہ جو اپنی رنگت اور خون کے لحاظ سے تو ہندوستانی ہو مگر اپنے ذائقے، رائے، اخلاق اور ذہن سے وہ انگریز ہو۔51 دوسرے لفظوں میں اپنے مفاد کے لیے اور انتظامی امور سنبھالنے کے لیے ایک ایسا ممتاز طبقہ بنایا جو ان کا منتخب زدہ تھا جسے انڈین سول سروس (Indian Civil Service) کا نام دیا۔ ان کی تعداد مشکل سے بارہ سو تھی مگر ان کے نیچے ہزاروں کی تعداد میں لوگ کام کرتے تھے۔ یہ افسر شاہی کا تحفہ آنے والے وقت میں ہندوستان اور نئے ملک پاکستان کی اقوام کے لیے بہت بڑا خطرہ تھا۔ انگریز کی رائج کردہ تعلیم اور افسران اعلیٰ کی فوج یہ دونوں ہی عوام کے لیے دباؤ اور طبقاتی فرق کا باعث تھے۔52

انگریزوں نے ہندوستان میں رہنے والوں میں مذہب، رنگ، نسل، ذات اور برادری کی بنیادوں پر پھوٹ ڈلوائی اور انہیں الگ کیا۔ ہندوستان میں اس وقت سرمایہ داری کا نام و نشان نہیں تھا۔ برطانوی راج سے پہلے جاگیردارانہ نظام کا طریقہ ہندوستان میں کچھ اور تھا۔ زمین بادشاہ کی ملکیت ہوتی تھی اور رعایا زمین پر وارثتی حقوق رکھتی تھی۔ انگریز نے زمین کے بڑے بڑے رقبے ان خاص خاص لوگوں کو دیے جو ان کے عوام سے زبردستی راج کے احکام منواتے تھے۔ یہ جاگیردار ہمارے حکمران طبقے میں شامل ہو گئے۔ مفاد پرستی کی جڑیں مضبوط ہوئیں اور ان کالی چمڑی اور انگریزی سوچ والے افراد نے تعلیم میں طبقے کے فرق کو مزید تقویت دی۔ ہم نے تاریخ کے سفر میں دیکھا ہے کہ ریاست وہی تعلیم عام کرتی ہے جو اس کے مفاد میں ہوتی ہے اور اس کے مفاد میں زیادہ تر وہی ہوتا ہے جو حکمران طبقوں کے مفاد میں ہوتا ہے۔ ریاست کو ایک خاص قسم کا ذہن بنانا ہوتا ہے لہذا وہ تعلیمی نظام کو نظریات کے پھیلانے کا سب سے موثر طریقہ سمجھتی ہے۔53 پاکستان میں نیم جاگیردارانہ اور نیم سرمایہ دارانہ نظام رائج ہے۔ ہمارے دیہی علاقوں میں جاگیردارانہ اور شہری علاقوں میں سرمایہ دارانہ نظام پر مبنی معاشرہ نظر آتا ہے، یہاں پر دیہی علاقوں میں تو اسکول نہ ہونے کے برابر ہیں جب کہ شہروں میں یہ ایک بڑے طبقاتی فرق کے ساتھ موجود ہیں۔54

پاکستان کی آبادی 185 ملین ہے۔55 جس میں تقریباً 57 فیصد آبادی تعلیم یافتہ ہے۔56 اس وقت ملک کا نظام تعلیم چار اقسام میں بٹا ہوا ہے۔ مدارس، سرکاری اسکول، نجی تعلیمی ادارے اور کیمبرج سسٹم۔57 یہ چاروں نظام ملک میں ایسے معاشرے کو تشکیل دیتے ہیں جو طبقاتی روش کو تقویت دیتا ہے جس کا فائدہ ملک میں موجود جاگیردار اور سرمایہ دار اٹھاتے ہیں۔

غربت اور پسماندگی کی وجہ سے طبقاتی فرق نے ترقی کی راہ میں بے انتہا رکاوٹیں حائل کی ہیں مگر یہاں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ تعلیمی نظام از خود طبقاتی تفریق کا باعث ہے۔ غریب اپنے بچے کو چاہ کر بھی اسکول میں داخل نہیں کرسکتا، کیونکہ اگر وہ اسے اسکول میں داخل کروا دے گا تو کھائے گا کہاں سے؟ تعلیمی نظام میں سرمایہ دارانہ نظام اس طرح شامل ہوچکا ہے کہ ہم چاہیں بھی تو اسے ایک دوسرے سے الگ کر ہی نہیں سکتے۔

طالب علم کو ایک ایسی مبالغہ آمیز مقابلہ بازی میں پھنسا دیا جاتا ہے جس میں اسے ایسی کامیابی کی عبادت کی تربیت دی جاتی ہے جس میں وہ صرف اپنے مستقبل کو کامیاب بنانے کے لیے سرگرداں ہو۔ اس برائی کا مقابلہ ہم صرف ایک ایسی سماجی معیشت کے فروغ سے کر سکتے ہیں جو لوگوں کے مفاد کو مدنظر رکھتے ہوئے ان میں کام تقسیم کرے اور سب کو زندگی گزارنے کے لیے ایک جیسے حقوق ملیں۔58

اشرافیہ کی اولاد تو ملک پر حکمرانی کے لیے ہی سنواری جاتی ہے لیکن وہ طبقہ جو محنت سے اپنی اولاد کو مہنگی ترین تعلیم دلواتا ہے ایسے ''منشی'' پیدا کرتا ہے جو صرف

سرمایہ دار کے سرمائے اور اثاثے کو پروان چڑھاتا ہیں۔ سرمایہ دارانہ تعلیم ان کو صرف ایک ذاتی حدف کی چاہ دیتی ہے کہ وہ تعلیم کو مفید ذرائع کے لیے استعمال کریں، مہنگی ترین علاقے میں کنال دو کنال کا گھر بنائیں، کسی بڑی ملٹی نیشنل کمپنی میں ملازمت کریں اور ان ہی کمپنیوں کی استحصالی ٹیکنالوجی حاصل کرکے زندگی گزاریں یا پھر اعلیٰ تعلیم حاصل کرتے ہی یورپ یا امریکہ ہجرت کرجائیں۔ پھر وہاں بیٹھ کر اپنے ہم وطنوں کو تنقید اور حقارت کی نگاہ سے دیکھنے لگیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ ہونہار طالب علم کہاں گیا جو پورے گاؤں کی امید تھا؟ کیا ہمیں غور کرنے کی ضرورت نہیں کہ ہماری آنے والی نسلیں یوں ہی بنا کسی مقصد کے تباہ ہو جائیں گی؟

آزادی کے اتنے سال گزر جانے کے باوجود پاکستان ابھی تک ترقی پزیر ملک میں شامل ہے، اس کی وجہ معاشرتی یا معاشی بگاڑ ہی نہیں بلکہ یہ سماجی و معاشی پسماندگی پاکستان میں بڑی حد تک سرمایہ دارانہ نظام کی تکمیل کی وجہ سے ہے۔ امیر طبقے کے بچے لاکھوں روپے خرچ کرنے کے بعد بھی مزید تعلیم حاصل کرنے ملک سے باہر ہی جاتے ہیں، گو کہ یہاں جو تعلیم حاصل کی وہ نامکمل تھی یا اسے مزید نکھار وہاں جاکر ہی آسکتا ہے۔ اس کی وجہ پر غور کریں تو یہ تعلیمی نظام گورے ملکوں نے ہم پر رائج کیا اور ظاہر ہے ایک سوچ کے تحت ہی مسلط کیا گیا۔ یہ سوچ کیا تھی؟ یہ وہ تفریق تھی جس میں خود بخود طبقے غیر محسوس طریقے سے پروان چڑھتے رہے جو سرمایہ دارانہ نظام کی کامیابی کے لیے انتہائی ضروری ہیں۔

ہمیں اس تفریق کو ختم کرنے کے لیے طبقاتی فرق اور اس جڑے عناصر کو سمجھنے اور انہیں ختم کرنے کے لیے اقدامات کرنے کی ضرورت ہے۔

حوالہ جات

1. Hill, Jenny. "Ancient Egyptian Hieroglyphics." AEO, 2015. Accessed from http://www.ancient-egypt-online.com/ancient-egyptian-hieroglyphics.html
2. Donn, Lin. "Ancient Egypt for kids: scribes." Mr Donn's Site for Kids and Teachers. Accessed from http://egypt.mrdonn.org/scribes.html
3. Canadian Museum of History. "The golden age of Greece." Canadian Museum of History. Accessed from www.historymuseum.ca/cmc/exhibitions/civil/greece/gr1050e.shtml
4. Guisepi, Robert. "The history of education." January, 2007. International World History Project. Accessed from http://history-world.org/history_of_education.htm
5. Public broadcasting services. "Two faces of Greece: Athens and Sparta." Accessed from http://www.pbs.org/empires/thegreeks/educational/lesson1.html
6. Mastin, Luke. "The basics of philosophy." 2008. Luke Mastin. Accessed from www.philosophybasics.com/movements_sophism.html
7. Duke, George. "The sophists (Ancient Greek)." The Internet Encyclopedia of Philosophy (IEP). Accessed from http://www.iep.utm.edu/sophists/
8. Guisepi, Robert. "The history of education." International World History Project January 2007. Accessed from http://history-world.org/history_of_education.htm
9. Ibid.
10. Newman, Simon. "Social classes in the Middle Ages." The Finer Times, 2015. Accessed from http://www.thefinertimes.com/Middle-Ages/social-classes-in-the-middle-ages.html
11. Guisepi, Robert. "The history of education." International World History Project, January 2007.
12. Havlidis, Dimitris Romeo. "Medieval education in Europe: a force of freedom and submission." Lost Kingdome, Project Cove. Accessed from http://www.lostkingdom.net/medieval-education-in-europe/.
13. Ibid.
14. Newman, Simon. "Guilds in the Middle Ages." The Finer Times, 2015. Accessed from http://www.thefinertimes.com/Middle-Ages/guilds-in-the-middle-ages.html
15. Ibid.
16. Ibid.
17. Frater, Jamie. "Top 10 inventions of the Middle Ages." Listverse Ltd, 2015. Accessed from http://listverse.com/2007/09/22/top-10-inventions-of-the-middle-ages/
18. James, Tom. "Black death: the lasting impact." 2011, BBC. Accessed from http://www.bbc.co.uk/history/british/middle_ages/black_impact_01.shtml
19. Gottfried, Robert S. "The black death: natural and human disaster in medieval Europe." Simon Schuster, 2010.
20. Byrne, Joseph, Patrick. "The black death." The Greenwood Publishers, 2004.
21. Greer, Brian et al (eds). "Culturally responsive mathematics education." Routledge, 2009.
22. Grendler, Paul F. "Europe 1450 to 1789: Encyclopedia of the early modern world." The Gale Group Inc., 2004. http://www.encyclopedia.com/topic/Renaissance.aspx
23. Ibid.
24. Ibid.
25. Guisepi, Robert. "The history of education." International World History Project, January 2007.
26. Kreis, Steven. "The history guide: lectures on modern European intellectual history, Lecture 17, the origins of industrial revolution in England." The History Guide, 2011. Accessed from http://www.historyguide.org/intellect/lecture17a.html
27. Ibid.
28. Ibid.
29. Rothbard, Murray N. "Hail, Prophet of 'Empiricism': rethinking Sir Francis Bacon" an excerpt from "An Austrian perspective on the history of economic thought." Vol. 1, Economic Thought Before Adam Smith. The Mises Institute, September, 2010. Accessed from https://mises.org/library/hail-prophet-empiricism-rethinking-sir-francis-bacon
30. Ibid.
31. Harding, Sandra. G. "The science question in feminism." Cornell

University Press, 1986, p. 74.
32. Ibid, p. 38.
33. Ibid.
34. Ibid, p. 39.
35. Noble, David F. "America by design: science, technology, and the rise of corporate capitalism." Knopf. Alferd A. New York, 1977, p. 168.
36. Bellamy, Foster, J. "Education and the structural crisis of capital: the U.S. case." Monthly Review, Volume 63, July-August, 2011. Accessed from http://monthlyreview.org/2011/07/01/education-and-the-structural-crisis-of-capital/
37. Noble, David F. "America by design: science, technology, and the rise of corporate capitalism." Knopf. Alferd A. New York, 1977, p. 167.
38. Ibid, p. 49.
39. Ibid, p. xxiii and p. xxiv.
40. Ibid, p. 22.
41. JR. Kloppenburg, Jack R. "First the seed." The University of Wisconsin Press, 2004, p. 227.
42. Noble, David F. "America by design: science, technology, and the rise of corporate capitalism." Knopf. Alferd A. New York, 1977, p. xxii.
43. Ibid, p. xxii.
44. JR. Kloppenburg, Jack R. "First the seed." p. 22.
45. McNeese State University. "The benefits of studying philosophy." Accessed from
http://www.mcneese.edu/philosophy/the-benefits-of-studying-philosophy
46. Delany, Ella. "Humanities studies under strain around the globe." The New York Times. December 1, 2013. Accessed from
http://www.nytimes.com/2013/12/02/us/humanities-studies-under-strain-around-the-globe.html?_r=0
47. IBON Primer on Climate Change, "Introduction." IBON International 2008, p. 1. Accessed from http://iboninternational.org/sites/ibon/files/resources/ibon_primer_on_climate_change.pdf
48. Stavrianos, L.S. "The global rift: the third world comes of age." William Morrow and Company, Inc, New York, 1981, p. 107. 295; Gillard, Derek. "Education in England: a brief history." Derek Gillard, 2011. Accessed from
http://www.educationengland.org.uk/history/chapter03.html#05
49۔ حسن صبیحہ، ''یورپ کا جاگیرداری دور اور نوآبادیاتی تسلط۔'' جنوری تا اپریل، 2013، چیلنج، صفحہ 5، جلد 6، شمارہ 1۔
50. Davis, Mike. "Late victorian holocausts: El nino famines and the making of the third world." Verso, 2001, p. 311.
51۔ سہگل روبینہ۔ ''پاکستان کے مسائل اور تعلیمی بحران۔'' قومیت، تعلیم اور شناخت، فکشن ہاؤس، 1997، صفحہ 40۔
52. Ewing, Ann. "Administering India: The Indian civil service." History Today Volume 32, June 6th 1982. Accessed from
http://www.historytoday.com/ann-ewing/administering-india-indian-civil-service
53۔ سہگل روبینہ۔ ''پاکستان کے مسائل اور تعلیمی بحران۔'' قومیت، تعلیم اور شناخت، فکشن ہاؤس، 1997، صفحہ 40۔
54۔ ایضاً، صفحہ 35۔
55. Worldmeters. "Population." Worldometers.info, 2015. Accessed from http://www.worldometers.info/
56. Maps of World. "World illiteracy map." Maps of World. Accessed from
http://www.mapsofworld.com/thematic-maps/world-illiteracy-map.htm
57۔ جان، علی احمد۔ ''پاکستانی نوجوان اور تعلیم۔'' جنوری تا اپریل، 2014، چیلنج، صفحہ 30۔ جلد 7، شمارہ 1۔
58. Einstein, Albert. "Why socialism?" Reprinted from Monthly Review, New York, May, 1949. Transcribed by Lenny Gray. Accessed from http://www.huppi.com/kangaroo/Einstein.htm

---

(بقیہ حوالہ جات: دریا کے کنارے آباد بستیاں اور موسمی بحران)

11. Govermentt of Pakistan. "Annual Flood Report 2014." p. 8. Accessed from
http://ffc.gov.pk/download/Annual%20Flood%20Report%202014.pdf.
12. Govermentt of Pakistan, "Annual Flood Report 2010." p. 5. Accessed from
http://www.ffc.gov.pk/download/flood/archieve/Annual.report2010.pdf
13. Budhani, Azmat and Gazdar, Haris. "Land rights and the Indus flood, 2010-2011: Rapid Assessment and Policy Review." Oxfam Research Report, June, 2011. p. 9. Accessed fromhttp://www.researchcollective.org/Documents/Land_Rights_and_The_Indus_Flood_2010_2011.pdf
14. Ibid.
15. K. K Consultants. "Study of riverine forest upstream Sukkur and down stream Kotri 2008." Indus for All Programme. WWF-Pakistan, 2008. p. 6. Accessed from
http://foreverindus.org/pdf/riverine_forest%20updownstream2008.pdf
16. Memon, Altaf, A. "An overview of the history and impacts of the water issue in Pakistan." The World Sindhi Institute, Washington DC, USA 9 November, 2002. P. 6. Accessed from
http://waterinfo.net.pk/sites/default/files/knowledge/An%20Overview%20of%20the%20History%20and%20Impacts%20of%20the%20Water%20Issue%20in%20Pakistan.PDF
17. Ghazanfar, Munir. "The enviromental case of Sindh." Lahore Journal of Policy Studies 3 (1): December, 2009.
18. Sardar, Shahzad, Muhammad. et al. "Poverty in riverine areas: vulnerabilities, social gaps and flood damages." Pakistan Journal of Life and Social Sicience, 2008.
19. K. K Consultants. "Study of riverine forest upstream Sukkur and down stream Kotri 2008. "Indus for All Programme. WWF-Pakistan, 2008.
20. IBON. "IBON Primer on climate change." IBON International, 2008. Accessed from
http://iboninternational.org/sites/ibon/files/resources/ibon_primer_on_climate_change.pdf
21. Social Watch. "Demanding climate justice." 24 April, 2014. Accessed from http://www.socialwatch.org/node/14971

اصلاح پسندی آخر کب تک!

تحریر: آصف خان

دنیا بھر میں آج کل پائیدار ترقی کے اہداف (Sustainable Development Goals/SDG) پر بحث ہو رہی ہے، عوامی گروہ جو بنیادی تنقید پیش کرتے ہیں وہ عدم مساوات ہے۔ عدم مساوات غریب اور امیر ممالک میں، ایک ملک کے اندر غریب اور امیر طبقہ میں اور مرد اور عورت میں استحصال کی بنیادی وجہ ہے۔ جب پاکستان بنا تو اس وقت 21 خاندانوں کا نام سنا تھا جن کے پاس بہت زیادہ وسائل تھے جب کہ بہت بڑی آبادی بنیادی ضروریات کو بھی ترس رہی تھی۔ موجودہ حالات کو دیکھیں تو ہم یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ ان خاندانوں میں کمی ہوئی ہے یا اضافہ ہوا ہے لیکن یہ ضرور نظر آتا ہے کہ اس وقت بھی ملک کی زیادہ تر آبادی کا استحصال ہو رہا ہے۔ ایک کم تعداد پر مبنی طبقہ وسائل پر حاوی ہے اور وہی اس ملک پر حکومت کر رہا ہے۔ اس آمر طبقے کی خدمت کے لیے کئی گروہ کام کرتے ہیں جن میں این جی اوز، فلاسفر، تجزیہ نگار اور افسر شاہی شامل ہیں۔ ان گروہوں کا نقطہ نظر یہ ہے کہ پاکستان میں غربت کی وجہ کمزور جمہوری نظام، دہشت گردی، کرپشن، ناانصافی اور نفاق ہے۔

اس مفاد پرست ٹولے کا خیال ہے کہ موجودہ پیداواری نظام میں رہتے ہوئے پاکستان کے عوام اگر حکومت کا ساتھ دیں اور ان کے درمیان اتحاد و اتفاق ہو جائے تو غربت سمیت تمام مسائل ختم ہو سکتے ہیں۔ پاکستان کے چاروں صوبوں میں کام کرنے والی نیم سرکاری این جی اوز اور مائیکرو کریڈٹ پر کام کرنے والی تنظیموں کے نزدیک غربت کی وجہ یہ ہے کہ منڈی، قرضے اور لازمی خدمات تک عوام کی رسائی نہیں ہے۔

ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان گروہوں نے غربت کو سماجی، اقتصادی، سیاسی، ماحولیاتی انصاف اور پدرشاہی نظام کے تناظر میں نہیں دیکھا جو مقامی، قومی اور بین الاقوامی سطح پر باہم مل کر محرومی، لاچاری اور جبر کا باعث بنتے ہیں۔ آج دنیا بھر کے عوام دراصل ان بنیادی ستونوں یعنی سماجی انصاف (جس میں مرد اور عورت کے درمیان مساوات بھی شامل ہیں) اور سیاسی، اقتصادی اور ماحولیاتی انصاف کی شدید کمی کو عالمی، قومی اور مقامی سطح پر پائے جانے والی شدید غربت کی وجہ سمجھتے ہیں۔ اگر ان تمام شعبوں سے ناانصافی کا خاتمہ ہوجائے تو عوام کے لیے محرومی بے کسی کے اس چنگل سے باہر نکلنے کی خاطر خواہ راہ ہموار ہو جائے۔ اس استحصالی نظام کے پیروکار عوام کے ساتھ ہونے والے استحصال اور اس کی اصل وجوہات پر بات نہیں کرتے بلکہ عوام کو یہ یقین دلانے کی کوشش کرتے ہیں کہ جمہوریت اور انسانی حقوق ہی ہمیں غربت و افلاس سے چھٹکارا دلا سکتے ہیں۔ پورے ملک میں گلی محلوں کی سطح پر بڑے بڑے منصوبے چل رہے ہیں جن کے لیے یورپ اور امریکا کے عوام دشمن ادارے بڑے پیمانے پر وسائل مہیا کر رہے ہیں۔

اب میں بات کروں گا صوبہ خیبر پختون خواہ کے ضلع ہری پور کی جہاں پر سیکڑوں ادارے اور این جی اوز کام کررہی ہیں۔ یہ ہمارے گاؤں، محلوں میں کئی منصوبے چلاتے ہیں اور عوام سے ملکی مسائل پر بات کرتے ہوئے حقوق اور جمہوریت کا درس دیتے ہیں۔ یہ این جی اوز علاقائی تنظیموں کے ساتھ مل کر کام کرتی ہیں۔ ان میں مائیکرو کریڈٹ پر کام کرنے والی این جی اوز زیادہ نمایاں ہیں جو ہمارے علاقے میں صحت، تعلیم، عورتوں کے حقوق اور چھوٹے کاروبار کی ترقی کے لیے کام کررہی ہیں۔ ان اداروں کے خیال میں ہماری غربت، تعلیم، بے روزگاری اور صحت کے مسائل اس لیے ہیں کہ ہم منظم نہیں ہیں، ہم اپنی مدد آپ کے تحت کچھ نہیں کرتے اور ساری ذمہ داری حکومت پر ڈال دیتے ہیں۔ مزید یہ کہ حکومتی نمائندوں کا کام صرف قانون سازی کرنا ہے ادارے چلانا نہیں۔ ان پروگراموں میں عوام کو یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ کوئی بھی تنظیم یا ادارہ آپ کے علاقے میں کام کررہا ہو اس کی راہ میں رکاوٹ نہ بنیں چاہے کام کیسا بھی ہو، آپ نے ہر حال میں امن امان قائم رکھنا ہے چاہے حالات کیسے بھی ہوں ورنہ آپ کو کوئی ادارہ ترقیاتی کاموں کے لیے پیسہ نہیں دے گا۔

پاکستان میں عوام کی مشکلات کا حل صرف سیاسی ہے لیکن یہ این جی اوز عوام کو سیاست سے دور کرنا چاہتی ہیں اس کی مثال مندرجہ ذیل ایک بیان ہے۔ مورخہ 6 جنوری، 2015 کوملکی سطح پر کام کرنے والی نیم سرکاری این جی اوز کے صوبائی عہدیدار نے حطار کی ایک تنظیم کو امدادی رقم بذریعہ چیک دینے کی تقریب میں کہا کہ سماجی رضا کاروں کو سیاسی نہیں ہونا چاہیے نا کسی سیاسی جماعت میں شامل ہونا چاہیے اور نہ ہی اس کی حمایت کرنی چاہیے بلکہ جو بھی سیاسی نمائندہ منتخب ہو اس کے ساتھ مل کر کام کرنا چاہیے۔ اگر کوئی سماجی کارکن سیاست میں شامل ہو یا کسی ایک سیاسی جماعت کی حمایت کرے تو اسے کسی بھی علاقائی تنظیم میں شامل نہیں کرنا چاہیے کیونکہ این جی اوز غیر سیاسی لوگ ہیں اور ہر حکومت سے مل کر ترقیاتی کاموں میں اس کی مدد کرتی ہیں۔

اسی طرح مائیکرو کریڈٹ پر کام کرنے والی این جی اوز کے ایک اور صوبائی عہدیدار کے مطابق تنظیموں کو حکومتی پالیسیوں کے خلاف بات نہیں کرنی چاہیے اور نہ ہی کوئی ریلی یا احتجاج کرنا چاہیے، اگر حکومت یا سرمایہ دار کسی مزدور یا کسان کے ساتھ زیادتی کرتا ہے تو کارکنوں کو اس کے خلاف براہ راست احتجاج نہیں کرنا چاہیے کیونکہ تنظیموں کا دائرہ کار نہیں ہے کہ وہ حکومت کی پالیسیوں کو چیلنج کریں۔ یہ پیغام بھی صاف تھا کہ اگر کوئی ادارہ ایسا کرے گا تو اس کے ساتھ کام روک دیا جائے گا۔

ان اداروں اور این جی اوز نے کبھی بھی جاگیرداری نظام کے خلاف بات نہیں کی جو عوامی فلاح کی پہلی سیڑھی ہے۔ ہمارے ملک میں بڑی تعداد بے زمین کسانوں کی ہے اور بہت کم لوگوں کے پاس بہت زیادہ زمین ہے۔ زمین ہی وہ بنیادی اکائی ہے جس سے زندگی رواں دواں ہے۔ جن لوگوں کے پاس ہزاروں ایکڑ زمین ہے انھوں نے اس زمین سے بے تحاشا دولت کمائی ہے۔ اب وہی لوگ اس ملک کے حکمران بنے بیٹھے ہیں جب کہ دوسری طرف بے زمین کسان ان جاگیرداروں کی زمین پر کام کرتے ہیں ان کی زندگی دشواریوں کا محور ہے۔ جاگیردار دن رات ان کسانوں سے کام کرواتا ہے جب فصل تیار ہوتی ہے تو مختلف حربوں سے زیادہ فصل جاگیردار لے لیتا ہے اور کسان کا خاندان بھوکا رہتا ہے، اس کے علاوہ بے زمین کسان کی عزت بھی جاگیردار سے محفوظ نہیں ہوتی۔ بے زمین کسان اپنی مرضی سے کچھ نہیں کر سکتا ایک طرح سے وہ جاگیردار کا غلام ہوتا ہے۔

سرمایہ دارانہ نظام میں سرمایہ دار اور مزدور کا پیداواری رشتہ ہے۔ اس نظام میں مزدور کا استحصال لازمی ہے کیونکہ سرمایہ دار مزدور سے زیادہ کام کرواتا ہے اور بہت کم اجرت دیتا ہے جس کی وجہ سے وہ زیادہ منافع کماتا ہے، جب کہ مزدور زیادہ کام کر کے بھی باعزت زندگی نہیں گزار سکتا۔ یہ بات یقینی ہے کہ مزدور کا استحصال کیے بغیر سرمایہ دارانہ نظام کی کامیابی ناممکن ہے۔

این جی اوز کے اجلاس اور سیمیناروں میں عورت اور مرد کے حقوق پر بہت بات کی جاتی ہے کہ وہ برابر ہیں، عورت اور مرد کو تعلیم، روزگار اور فیصلہ سازی وغیرہ میں برابری کے مواقع ملنے چاہیے۔ حقیقتاً ہمارے گھروں میں ہی عورت کے ساتھ امتیازی سلوک ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔ گھر کے سارے فیصلے مرد کے اختیار میں ہوتے ہیں۔ ایک طرف لڑکے کو بہتر تعلیم اچھا کھانا دیا جاتا ہے جب کہ لڑکی کا اس معاملے میں خیال نہیں کیا جاتا اس کے پیچھے ایک سوچ یہ ہے کہ لڑکے نے کمانا ہے اور لڑکی نے تو گھر ہی سنبھالنا ہے۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ جب تک عورت کی پیداواری نظام میں برابری نہیں ہوگی تب تک حالات ٹھیک نہیں ہو سکتے۔ سب سے پہلے اس ملک کی زمین کسان عورت اور کسان مرد میں مساویانہ اور منصفانہ بنیادوں پر تقسیم ہو تب جا کر مرد اور عورت کو یکساں حیثیت میں لایا جاسکتا ہے۔

بچوں سے مشقت بھی اسی استحصالی نظام کا نتیجہ ہے۔ این جی اوز آج کل بچوں سے مشقت کرانے پر بڑے بڑے پروگرام منعقد کروارہی ہیں کہ بچوں سے مزدوری نہ کروائی جائے بلکہ انہیں تعلیم دلوائی جائے۔ کوئی بھی والدین خوشی سے اپنے بچوں سے کام نہیں کرواتے بلکہ ان کی حسرت ہوتی ہے کہ ان کی اولاد پڑھ لکھ کر اس ملک کی باعزت شہری بنے۔ معاشرے سے اس برائی کا خاتمہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ نظام کا خاتمہ نہ کر دیا جائے۔ اس ملک کی زیادہ تر آبادی غربت کی دشوار زندگی گزار رہی ہے، یہ بے رحم زندگی نہ تو عوام خود اپناتی ہے اور نہ ہی ان کے مقدر کا نتیجہ ہے۔ خود جاگیردار اور سرمایہ دار جانتے بوجھتے بچوں کے استحصال کی راہیں مضبوط کرتے ہیں۔ اگر کسان اور مزدور کو بہتر روزگار حاصل ہو تو اس کا گھرانہ خوشحال ہوگا اور اسے زندگی گزارنے کے لیے بچوں سے کام کروا کر مزید اجرت نہیں ڈھونڈنی پڑے گی۔ لیکن ہمارا معاشرہ ان جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کو ذمہ دار نہیں ٹھراتا بلکہ ماں باپ کو قصوروار گردانتا ہے یا حد سے حد اس کو سماجی برائی کہہ کر استحصالی طبقہ کو بری الذمہ کر دیتا ہے۔

دراصل یہ سرمایہ دارانہ پالیسیوں کا نتیجہ ہے جس کے تحت آج غذا، تعلیم، صحت، روزگار اور دیگر عوامی سہولیات کی فراہمی نجی شعبے کے حوالے کر دی گئی ہے۔ ہماری حکومتیں عالمی مالیاتی اداروں سے مخصوص شرائط پر قرض وصول کرتی ہیں جنہیں اسٹرکچرل ایڈجسٹمنٹ پروگرام کہا جاتا ہے۔ ان اداروں سے قرض لیتے وقت ہماری حکومتیں اشرافیہ کے مفاد کو مدنظر رکھتے ہوئے عوام دشمن شرائط تسلیم کر لیتی ہیں۔ گزشتہ سالوں میں ان قرضہ جات کے بدلے خاص کر کے زراعت سے مراعات کا خاتمہ کر دیا گیا ہے اس کے علاوہ سرکاری شعبوں کو نجکاری کے ذریعے نجی شعبوں میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔

انہی مالیاتی اداروں کے کہنے پر گیس، بجلی اور تیل کی قیمت میں کئی گنا اضافہ کر دیا گیا ہے۔ ہر سال سیکڑوں مزدوروں کو نوکری سے نکالا جارہا ہے، جو باقی رہ گئے ہیں ان کے لیے بھی مراعات کا خاتمہ کیا جارہا ہے۔ ایسی صورت حال میں دیہی اور غریب آبادی کے مکین اپنے بچوں کو کیسے اسکول میں داخل کروا سکتے ہیں۔ ان بچوں کے لیے بہترین صحت اور تفریح کے مواقع کیوں کر ممکن ہوں گے۔ یقیناً جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام کے ہوتے ہوئے بچوں سے مشقت کا خاتمہ ممکن نہیں۔

آج کل ہر روز ٹی وی اور اخبارات میں آرہا ہے کہ موسمی تبدیلی ہورہی ہے۔ بے موسم بارش ہو رہی ہے، اولے پڑ رہے ہیں، بارش کے بغیر دریاؤں میں طغیانی آرہی ہے، زیادہ تعداد میں طوفان اور زلزلے آرہے ہیں اور کئی طرح کی موسمی آفات آرہی ہیں جس سے سب سے زیادہ نقصان غریب کسان و مزدور کا ہورہا ہے۔ قدرت کے نظام میں ایک توازن ہے جب اس میں خلل پڑتا ہے تو قدرت کا نظام بگڑ جاتا ہے جس کی وجہ سے زیادہ یا کم بارشیں ہوتی ہیں اور سیلاب آتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ قدرت کے نظام میں مداخلت کون کر رہا ہے؟ ہر روز فضا میں کاربن ڈائی اکسائیڈ اور دیگر زہریلی گیسیز کی ملاوٹ ہورہی ہے یہ گیسیز کہاں سے آتی ہیں؟ ظاہر ہے یہ کارخانوں اور گاڑیوں سے نکلنے والے دھویں سے فضا میں شامل ہورہی ہیں جس کی وجہ سے فضا میں آلودگی بڑھ رہی ہے۔ زمین کا درجہ حرارت بڑھتا جارہا ہے جس سے گلیشیئر پگھل رہے ہیں۔ سمندر میں پانی کی مقدار بڑھ رہی ہے اور بے موسم طوفان اور بارشیں ہو رہی ہیں۔ ان سب آفات کی وجہ سرمایہ دارانہ نظام ہے جو کارخانوں اور مشینری کے ذریعے پیداوار بڑھا کر بے تحاشا منافع کماتا ہے اور مزید کمانے کی فکر میں لگا رہتا ہے۔ ان مشینوں کے بغیر یہ نظام نہیں چل سکتا انہی کارخانوں

اورمشینری کے دھویں سے ماحولیاتی آلودگی ہورہی ہے۔ اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ سرمایہ دارانہ نظام کے ہوتے ہوئے ہم ماحولیات کو کبھی بھی بچا نہیں پائیں گے۔

ان اداروں اور قرضہ دے کر سود لینے والی این جی اوز نے کبھی بھی اس استحصالی نظام کے خلاف بات نہیں کی جس کی وجہ سے معاشرے میں عدم مساوات کی راہیں ہموار ہورہی ہیں، بلکہ یہ این جی اوز عالمی سرمایہ دارانہ ایجنڈے اور گلوبلائیزیشن کی پالیسیوں کی مضبوطی کے لیے دن رات سرگرم ہیں۔ ان این جی اوز کو سامراجی ممالک اور غیرملکی اداروں سے بہت زیادہ پیسہ عوام کی فلاح و بہبود کے نام پر ملتا ہے تا کہ ان اداروں کے مفاد کے خلاف کوئی کام ہورہا ہوتو اسے روکا جاسکے۔

درحقیقت یہ پیسہ عوام کی فلاح و ترقی کے لیے استعمال ہونے کے بجائے سامراجی پالیسیوں کی مضبوطی کے لیے استعمال ہوتا ہے جو عوام کو سیاسی و معاشی طور پر مفلوج کردیتا ہے تا کہ مقامی آبادیوں میں اگر مزاحمت کی کوئی بو پھیل رہی ہو تو اسے وہیں ختم کردیا جائے۔ ان سامراجی ممالک اور اداروں کا مقصد دنیا کے وسائل پر قبضہ کرنا اور صرف منافع کمانا ہے۔

ہمارے حکمران اور ان کے خدمت گار گروہ اگر عوامی فلاح و ترقی کے لیے کام کرتے تو ان سامراجی ممالک اور اداروں کا بازو نہیں بنتے جو دنیا پر قبضہ کرنے کے لیے ایسے قوانین بنا رہے ہیں جس کی وجہ سے ایک طرف تو زمین، خوراک، صحت، تعلیم اور صاف پانی وغیرہ کی فراہمی حکومتی اختیار سے نکل کر نجی کمپنیوں کے قبضہ میں جارہی ہے جبکہ دوسری طرف لاکھوں مزدور کم اجرت اور پیداواری مداخل کی منہ چڑھاتی مہنگائی کی وجہ سے خودکشیاں کرنے پر مجبور ہیں۔ حقیقت میں یہ این جی اوز عوام کو ذہنی اور معاشی طور پر مفلوج کرنے کا کام کرتی ہیں تا کہ عوام کو یہ باور ہو جائے کہ وہ ہمیشہ غلام ہیں اور ایک خاص طبقہ (جاگیردار، سرمایہ دار، فوج) ہی اس پر حکومت کرے گا اور یہ خاص طبقہ عوام کو جو کچھ دیتا ہے عوام اسی پر صبر اور شکر کرے۔

یہ حکمران دراصل عوام کی محنت کے بل بوتے عیاشیاں اور پھر عوام ہی پر حکمرانی کرتے ہیں۔ بین الاقوامی سامراجی ممالک اور اداروں سے جو پیسہ ان این جی اوز کو عوام کی فلاح، خدمات اور انسانی حقوق کے کاموں کے لیے دیا جاتا ہے اس پیسہ سے عوام کی فلاح ہو نہ ہو مگر ان این جی اوز میں کام کرنے والے لوگ پرتعیش زندگی ضرور گزارتے ہیں۔

یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ این جی اوز عالمی سامراجی نظام کو مضبوط کررہی ہیں۔ آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کی طرف سے تیسری دنیا کے ممالک پر عائد کردہ شرائط ہوں یا عالمی تجارتی ادارہ (WTO) کی پالیسیاں ہو یا ملٹی نیشنل کمپنیوں کی بے لگام سرگرمیاں، ان تمام اداروں کی حکمت عملیوں اور سرگرمیوں سے تیسری دنیا میں غربت، بھوک و افلاس، بے روزگاری، جرائم اور ماحولیاتی بگاڑ میں روز بروز اضافہ ہورہا ہے۔ این جی اوز جو مغربی ممالک کی حکومتوں اور دیگر غیرملکی اداروں سے ملنے والی امداد کی بنیاد پر کام کرتی ہیں وہ عالمی استحصالی ایجنڈے کو للکارنے کے بجائے چھوٹے موٹے ترقیاتی منصوبوں پر عمل پیرا ہیں۔ ایسی کوششوں سے کسی بھی ملک یا علاقے میں بنیادی تبدیلی نہیں لائی جاسکتی نہ عوام خوشحال ہو سکتے ہیں اور نہ ہی عزت کی زندگی گزار سکتے ہیں۔ ایسی این جی اوز کی وجہ سے مزاحمتی سوچ رکھنے والے سیاسی کارکن سیاسی تحریکوں اور تنظیموں کو منظم اور فعال کرنے کے بجائے اب این جی اوز کی ملازمت کرنے اور ان کے منصوبوں کو چلانے میں مصروف ہو گئے ہیں۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ چند مٹھی بھر این جی اوز اور کچھ منظم عوامی گروہ عالمی سامراجی اداروں عالمی بینک، آئی ایم ایف، عالمی تجارتی ادارہ اور ملٹی نیشنل کمپنیوں کے عالمی ایجنڈے کو چیلنج کرنے کی بھرپور کوشش کررہے ہیں۔ ان این جی اوز اور عوامی گروہوں نے نیو لبرل گلوبلائزیشن اور سرمایہ درانہ ایجنڈے کو نہ صرف کھل کر تنقید کا نشانہ بنایا ہے بلکہ بہت سے مواقعوں پر عالمی بینک اور آئی ایم ایف کی پالیسیوں کو یکدم ملک وقوم کے لیے تباہ کن قرار دینے میں کسی ہچکچاہٹ کا مظاہرہ نہیں کیا اور واضح الفاظ میں حکومتوں کو ایسی پالیسیاں اپنانے سے اپنی طاقت وحیثیت سے بڑھ کر روکنے کی کوشش کی ہے۔

پاکستان اور تیسری دنیا کے دیگر ممالک میں غربت، بے روزگاری اور پسماندگی کی وجوہات میں عالمی بینک، آئی ایم ایف، عالمی تجارتی ادارہ اور ملٹی نیشنل کمپنیوں کی پالیسیوں اور سرگرمیوں کے علاوہ نیم جاگیرداری نظام، سرمایہ دارانہ نظام، افسر شاہی اور مارشل لاء حکومتیں بھی شامل ہیں۔ ان تمام برائیوں کے خاتمے کے لیے صرف چند این جی اوز کا کردار کافی نہیں بلکہ ان کے خلاف دانشوروں، سیاسی مفکروں اور معاشرے کے دیگر منظم گروہوں کو بھی اپنا کردار ادا کرنا ہوگا۔

ان تمام برائیوں یا مسائل کا کوئی تکنیکی حل نہیں ہے بلکہ ان کا حل سیاسی ہے اور وہ یہ کہ پاکستان میں زمین کی منصفانہ اور مساویانہ بنیادوں پر تقسیم ہو، وسائل کے استعمال اور فیصلہ سازی میں اختیار عوام کا ہو۔ اس ملک میں کثیر تعداد کسان اور مزدوروں کی ہے جو کل آبادی کا 98 فیصد ہیں اس ملک کے مقدر کا فیصلہ ان کسانوں اور مزدوروں پر چھوڑ دیا جائے جو پوری دنیا کا پیٹ پالتے ہیں۔